اگست ۲۰۰۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

اسرائیلی بربریت اور اُمت مسلمہ کی بے حسی

فلسطین اور لبنان پر اسرائیل کی جارحیت ظلم و بربریت اور دہشت گردی کی بدترین مثال ہے، جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ عالمی سطح پر اس بربریت کی مذمت کی جاتی دنیا کی واحد سپریم پاور امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کی جارحیت کو حق بجانب قرار دے رہی ہے۔

نورِ اسلام سے یہودیوں کی دشمنی روزِ اوّل سے چلی آ رہی ہے اور اس کی بنیاد رسالتِ محمدی ﷺ ہے۔ آپ ؐ کی بعثت سے قبل نبوت و رسالت بنی اسرائیل میں چلی آ رہی تھی، مگر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو بنی اسماعیل میں مبعوث فرمایا تو یہودی اسلام اور اہل اسلام کے کٹر دشمن بن گئے۔ چنانچہ یہودیوں نے ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کیں۔ گزشتہ صدی میں سلطنت عثمانیہ سے خلافت کا خاتمہ بھی انہی کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ یہودیوں کے جرائم کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر بحیثیت قوم ذلت و مسکنت مسلط کی تھی اور ان کی پیٹھ پر پے در پے عذابِ الٰہی کے کوڑے برستے رہے۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ انیس سو برس سے در بدر کی ٹھوکریں کھانے والی یہودی اقلیت پوری دنیا کی معیشت پر عملاً قابض ہو چکی ہے۔ دنیا کی سیاست میں اثر و رسوخ کے علاوہ ثقافتی سطح پر بے حیائی اور فحاشی کا فروغ بھی اسی اقلیت کی کارستانی ہے۔ یہودیت کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ یہودی نوعِ انسانی میں افضل اور خدا کے چہیتے ہیں، جبکہ ان کے علاوہ باقی انسان گوئم اور gentiles یعنی انسان نما حیوان ہیں، جن کا ہر طرح سے استحصال جائز ہے۔ یہودیوں نے سازش کے تحت عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی جس سے انہیں عیسائیت پر غلبہ حاصل ہوا۔

انہوں نے ماضی میں وقت کی سپر پاور برطانیہ کے ذریعے ارضِ فلسطین پر قبضہ کیا اور اب وہ گریٹر اسرائیل کے قیام کے لیے امریکہ کو اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں اور اُسی کے سہارے مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ اسرائیل کی یہ بربریت انتہائی قابل مذمت ہے،

مگر اس سے بڑھ کر قابل مذمت اسرائیل کے لیے امریکہ کی حمایت ہے۔ امریکی صدر بش نے مسلمان حکمرانوں کو سختی سے ہدایت کی ہے کہ وہ اسرائیل کی ہرگز مذمت نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ان مظالم پر مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اِس وقت جبکہ بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جارہا ہے' مسلمان حکمرانوں کی خاموشی اُن کی حد درجہ بے حسی' بزدلی اور بے حمیتی کا بدترین مظہر ہے۔ اُمت مسلمہ کی زبوں حالی اللہ تعالیٰ کے دین سے بے وفائی اور غداری کا نتیجہ ہے۔ جب تک اس جرم کا ازالہ نہیں کیا جائے گا اُمت مسلمہ پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برستے رہیں گے۔ oo

ھماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے متفرق خطابات

☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

تذکرہ و تبصرہ

دین اور مذہب میں فرق

اور

سیکولرزم کی اصل حقیقت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کا خطابِ جمعہ

بمقام: مسجد دار السلام، باغ جناح، لاہور

ترتیب و تسوید: **کلیم اللہ**

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًاۢ بِالۡقِسۡطِ ؕ
لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۟ وَمَا
اخۡتَلَفَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ؕ
وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ
اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡاُمِّيّٖنَ
ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰﴾﴾ (آل عمران)

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾﴾ (آل عمران)

تفہیم آیات

سورۂ آل عمران کے ان دونوں مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان فرما دی گئی‘ جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اصلاً دین ہے‘ صرف مذہب نہیں۔ لیکن اس عظیم حقیقت کو موجودہ دَور میں سمجھنا اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ موجودہ دور کے کچھ اپنے تصورات ہیں اور ان تصورات سے مسلمان بھی بحیثیت مجموعی محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ آگے آ جائے گی۔

ان دونوں مقامات پر اسلام کا جو تذکرہ ہوا ہے‘ ایک جگہ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ اور دوسری جگہ اسی کا معکوس (converse) ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ تو دراصل بات ایک ہی ہے۔ بیان کرنے کا ایک مثبت انداز ہے۔ یعنی ’’بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے‘‘ یا ’’بے شک اللہ کے نزدیک اسلام دین ہے‘‘۔ یہ دونوں ترجمے مستعمل ہیں۔ اور یہی بات دوسرے مقام پر منفی انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ یعنی ’’جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو اُس سے یہ قبول نہیں کیا جائے گا‘‘۔ اللہ تعالیٰ اُسے قبول نہیں فرمائے گا۔ اس کا یہ مفہوم بھی از خود ہے کہ جو اسلام کو سوائے دین کے کسی اور حیثیت میں قبول کرے گا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا چاروں مفاہیم جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں ان کی روشنی میں تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ آپ متذکرہ بالا آیات کا ایک رواں ترجمہ

ذہن نشین کر لیں۔ آیت ۱۸ میں ایک عظیم حقیقت بیان ہو رہی ہے اور وہ ہے توحید۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ توحید کے ایک پہلو کا تعلق تو عقیدہ سے ہے' یعنی توحید فی الذات اور توحید فی الصفات' جو اصلاً ایک علمی معاملہ ہے' لیکن توحید کا دوسرا گوشہ جو توحید فی العبادات اور توحید فی الحاکمیت پر مشتمل ہے' یہی درحقیقت توحید عملی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ...﴾ ''اللہ خود گواہ ہے اس پر کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں......'' اس کے سوا کوئی مالک نہیں' کوئی حاکم نہیں' کوئی قانون عطا کرنے والا نہیں۔ الٰہ کے مفہوم میں یہ تمام گوشے شامل ہیں۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ ''اور (اس پر گواہ ہیں) تمام فرشتے اور اصحابِ علم بھی''۔ یعنی جو عقل مند انسان اپنی صحیح فطرت پر قائم ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ''(اللہ) قائم کرنے والا ہے عدل وانصاف کا''۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دنیا میں بظاہر اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ ہے' لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ بالآخر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا عدل نافذ ہو کر رہتا ہے' جبکہ آخرت میں تو اس کے عدل وقسط کا ظہور اپنی آخری اور تکمیلی شکل میں ہو کر ہی رہنا ہے۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ ''اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زبردست کمالِ حکمت والا ہے''۔

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ اب یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ ''اللہ کے نزدیک دین تو بس (ایک ہی ہے اور وہ) اسلام ہے''۔ اسلام کے معنی ہیں گردن جھکا دینا' سرِ تسلیم خم کر دینا' سپر انداختن۔ اب جبکہ وہی مالک ہے تو اُس کی اطاعت بھی لازم ٹھہری۔ لہٰذا نہ کوئی اس کا مدّ مقابل بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کی حاکمیت کے سامنے کسی اور کی حاکمیت کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارا معبود اور ہم اس کے عبد ہیں' وہ ہمارا مالک اور ہم اس کی ملکیت ہیں' وہ ہمارا حاکم اور ہم اس کے محکوم ہیں۔ ان تینوں چیزوں کو جمع کر لیجیے تو یہی درحقیقت اسلام کا تصور ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک واحد مقبول اور پسندیدہ طریقِ زندگی صرف اسلام ہے۔ اور یہ دین ہمیشہ سے یہی رہا

ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى......﴾(الشوریٰ:۱۳)''ہم نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی تاکید ہم نے نوحؑ کو کی تھی' اور جس کی وحی ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیمؑ' موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو بھی کی تھی۔'' لہٰذا دین میں تو کوئی فرق نہیں۔ یہ دین اسلام تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تفرقے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں سے آ گئی؟ لہٰذا ساتھ ہی اس کی وجوہ بھی بیان فرما دیں:﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ﴾ ''اور (اِس دین سے) اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی' مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا' آپس کی ضد اور حسد سے۔'' حقیقی علم اور اصل ہدایت اُن کے پاس آ چکی تھی' لیکن آپس کی ضدم ضدا اور ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی خواہش (the urge to dominate) اس تفرقے کا سبب بن گئی اور یوں اصل دین سے کئی شاخیں نکل آئیں۔ ایک شاخ دین سے علیحدہ ہوئی تو یہودیت بن گئی۔ اسی دین سے دوسری شاخ نکلی تو عیسائیت وجود میں آ گئی۔ حالانکہ دین تو ایک ہی ہے آدمؑ سے ایں دم۔﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ ''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرے تو (وہ جان لے کہ) اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن نشانیاں آ جانے کے بعد بھی اگر لوگ اُسی کفر اور غلط روش پر اڑے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ ''پھر بھی (اے نبیؐ) اگر یہ آپ سے جھگڑا کریں (حجت بازی یا دلیل بازی کریں) تو کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا رُخ اپنے پروردگار کی طرف کر لیا ہے (سرِ تسلیم خم کر دیا ہے) اور میرے ساتھ جو میرا اتباع کرنے والے ہیں (انہوں نے بھی یہی روش اختیار کر لی ہے)''۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ ہم نے تو دین اسلام عملاً قبول کر لیا ہے۔ یہ وہ اعلانِ براءت ہے جس

کی نمایاں ترین صورت قرآن حکیم میں بایں الفاظ سامنے آتی ہے : ﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳﴾ (الکفرون) ''کہہ دو کہ اے کافرو! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو' نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں''۔

﴿وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط﴾ ''اور (آپؐ) کہہ دیجیے اہل کتاب سے اور اُمّیین سے کہ کیا تم نے بھی (اُسی کی) اطاعت و بندگی قبول کی؟'' ﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ج﴾ ''پھر اگر وہ بھی اسلام لے آئیں (اور اسی طرح سرتسلیم خم کر دیں) تو وہ بھی ہدایت پر آ جائیں گے''۔ انہیں ہدایت پر آنے کے لیے کوئی کوہِ ہمالیہ سر نہیں کرنا' بس اپنی ضد اور سرکشی چھوڑنی ہے اور اللہ کے مدّ مقابل بننے کے دعوے سے دستبردار ہونا ہے۔ ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ﴾ ''اور اگر یہ روگردانی کریں تو (اے نبیؐ! آپ پریشان نہ ہوں) آپؐ کے ذمہ صرف پہنچانے کی ذمہ داری ہے''۔ ﴿وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰﴾ ''اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے''۔ کون کیا کر رہا ہے' اس کی نگاہ سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ ہر ایک کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہے گا۔

یہی بات' جیسا کہ گفتگو کے آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے' ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرما دی گئی: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ﴾ ''اور جو کوئی بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا''۔ اور اس میں تبعاً یہ مفہوم بھی میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ اگر کوئی اسلام کو بھی بحیثیت دین نہیں بلکہ صرف ایک عقیدے کے طور پر اختیار کرے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں پھر تفریق ہوگئی۔ دین کو اگر صرف عقائد اور عبادات تک محدود کر دیا جائے تو وہ دین نہیں' مذہب بن جائے گا۔ ﴿وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۸۵﴾ ''اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا''۔ یعنی ناکام و نامراد ٹھہرے گا۔

﴿كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡٓا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ﴾ ''اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے (دعوے کے) بعد پھر کفر کی روش اختیار کر لے اور اس بات کی بھی گواہی دے کہ یہ رسول حق ہیں''۔ گویا دعویٰ تو ایمان کا کریں، لیکن اسلام کو اختیار نہ کریں۔

زیر مطالعہ آیت پر مزید گفتگو سے پہلے میں ایک وضاحت کرتا چلوں۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران آپس میں جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی جو باہم نسبتیں ہیں ان میں سے ایک مناسبت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں زیادہ زور (emphasis) ایمان پر جبکہ سورۂ آل عمران میں اسلام پر ہے۔ ایمان اور اسلام اگرچہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، لیکن اپنی جگہ پر دونوں کی علیحدہ علیحدہ حقیقت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا: ﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ﴾ ''یہ بدّو کہہ رہے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (مسلمان ہو گئے ہیں) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک وحدت بھی ہیں، یعنی ایمان دل میں اور اسلام عمل میں۔ گویا ایک باطنی کیفیت ہے اور ایک اس کا خارجی طرزِ عمل ہے، اس کا ظہور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پر ان کی علیحدہ categories بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث جبرئیل (جسے اُمّ السُّنة کہا جاتا ہے) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ علیحدہ علیحدہ سوال کر کے اسلام اور ایمان کی تعریف (definition) معلوم کی۔ پہلے انہوں نے دریافت کیا: يَا مُحَمَّدُ اَخۡبِرۡنِىۡ عَنِ الۡاِسۡلَامِ[۱] ''اے محمد (ﷺ)! مجھے اسلام کے بارے میں آگاہ کیجیے''۔ جب آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی تو سوال کیا: فَاَخۡبِرۡنِىۡ عَنِ الۡاِيۡمَانِ ''اچھا تو مجھے ایمان کے بارے

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

میں آ گاہ کیجیے'' کہ ایمان کیا ہے' اس کی کیا definition ہے؟ تو آپؐ نے اس کی وضاحت بھی فرما دی۔

سورۃ البقرۃ میں ایمان پر جو زیادہ زور دیا گیا ہے اس کے حوالے سے میں تین مقامات کی طرف صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ سورۃ کی ابتدا میں فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۝۴﴾ سورۃ البقرۃ کے وسط میں آیۂ بر ہے: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ (آیت ۱۷۷) اور اختتام پر یہ آیت ہے: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ﴾ (آیت ۲۸۵) تو ان تینوں مقامات کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ زیادہ زور (emphasis) ایمان پر ہے۔ جبکہ سورۂ آل عمران میں زیادہ زور اسلام پر ہے' جیسا کہ ہم نے ابھی ان آیات کا مطالعہ کیا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ اور: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ چنانچہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کے مابین جہاں جوڑے ہونے کی اور نسبتیں ہیں وہاں ایک مناسبت یہ بھی ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں وہ لوگ جو ایمان کے مدعی ہوں اور پھر اسلام کو اختیار نہ کریں' یہ درحقیقت وہ category ہے جس میں آج کا مسلمان شامل ہے کہ دعویٰ تو ایمان کا ہے لیکن اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ہے ہمارا تضاد۔ گویا یہ آیت مبارکہ جس کا اِس وقت ہم مطالعہ کر رہے ہیں' بڑی تہدید والی آیت ہے اور یہ سب سے زیادہ آج کے مسلمان پر منطبق ہوتی ہے۔ فرمایا: ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ﴾ ''اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کریں (یعنی ایمان کا دعویٰ ہو لیکن اسلام کو اختیار نہ کریں)؟ اور

انہوں نے اس بات کی بھی گواہی دی کہ رسولؐ حق ہیں (وہ الصادق والمصدوق ہیں) اور وہ روشن نشانیاں لے کر آئے ہیں''۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

اگر یہ لوگ بھی اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہ ہوں تو پھر سب سے بڑے ظالم تو یہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم تو یہ ٹھہرے۔ جو ایمان کا دعویٰ نہیں کرتے اُن کا معاملہ تو علیحدہ ہو گیا' لیکن اگر دعویٰ ایمان کا ہو اور اسلام کو ایک دین کی بجائے ٹائٹل یا علامت کے طور پر اختیار کریں' اور محض اسی پر فخر ہو کہ ہم اُمتِ محمدﷺ ہیں' بلکہ عشقِ رسولؐ کا بھی دعویٰ ہو' تو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی''۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے بڑے مجرم یہی ہیں۔ اس لیے کہ اگر دعویٰ ایمان کا ہے لیکن نظام وہی اپنایا ہوا ہے جو نہ ماننے والوں کا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ تو منافقت ہو گئی! اور یہ جو قول و عمل کا تضاد ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب کفر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھڑکتا ہے۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (آیت ۱۴۵) ''بے شک منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''۔ یہاں فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''ہمیشہ رہیں گے اس میں' ان پر سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملے گی''۔ عذاب کے ضمن میں نرمی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں' ایک یہ کہ عذاب کی شدت میں کچھ تخفیف ہو جائے اور دوسری یہ کہ کچھ دیر کے لیے اس کا سلسلہ روک دیا جائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد پھر عذاب شروع ہو جائے۔ یہاں پر اِن دونوں صورتوں کی نفی کر دی گئی۔ گویا نہ تو کوئی مہلت اور وقفہ ہوگا اور نہ ہی عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی۔

البتہ اس سلسلے کی آخری آیت ہمارے لیے اُمید کی ایک کرن ہے۔ فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾﴾ ''سوائے ان کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کرلیں تو اللہ بڑا غفور بڑا رحیم ہے''۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ توبہ اور اصلاح انفرادی سطح پر بھی ہوگی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ انفرادی سطح پر توبہ کے ضمن میں کم از کم یہ مطلوب ہے کہ امکانی حد تک اپنی ذاتی اصلاح کی جائے اور اپنی معاش' معاشرت اور گھریلو زندگی کے جو بھی معاملات ہیں اُن کو منکرات سے پاک کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور خلافت کو اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں قائم کرنا ہوگا۔ اور یوں اس انفرادی سطح پر توبہ سے انسان کم از کم اُخروی عذاب سے تو بچ سکے گا۔ اس ضمن میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انفرادی توبہ تو میرے اور آپ کے دائرۂ اختیار میں ہے' لہٰذا اس میں کوئی عذر یا تأخیر اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔

جہاں تک اجتماعی سطح پر توبہ کا تعلق ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ قوم میں ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو انفرادی سطح پر توبہ کر چکے ہوں اور پھر وہ مجتمع ہو کر اور ایک قوت بن کر باطل نظام سے ٹکرا جائیں۔ اس کے نتیجے میں انقلاب آ جائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اب اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے اپنی اجتماعی زندگی پر نافذ کر دیا ہے۔ یہ اجتماعی سطح پر توبہ ہو جائے گی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' انفرادی سطح پر توبہ تو میرے اور آپ کے اختیار میں آج بھی ہے' لہٰذا اس میں کسی قسم کی تأخیر یا عذر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' البتہ اجتماعی توبہ میرے اور آپ کے بس میں نہیں ہے۔ یہ تو قوم کی ایک بڑی تعداد اسلام کو بحیثیت دین قبول کرے گی تب ہی ایسا ممکن ہوگا۔ اس اجتماعی توبہ کے لیے جدوجہد کو نظامِ خلافت کے قیام کے لیے کوشش کہہ لیں یا نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اسلامی انقلاب کا نام دے لیں' اصلاً یہ مختلف عنوانات سے اجتماعی توبہ کی سعی اور جدوجہد ہے۔ اس کا طریق کار میں عرض کر چکا ہوں کہ لوگ انفرادی سطح پر توبہ کرنے کے بعد جمع ہو کر

ایک طاقت بنیں اور پھر باطل کے نظام کو تلپٹ کر کے اسلام کو بحیثیت دین قائم کر دیں۔ اسی کا نام اقامت دین ہے' جس کا حکم بایں الفاظ دیا گیا: ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ﴾ (الشوریٰ: ۱۳) ''کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!'' اگر یہ کر لیں گے تو گویا ہماری اجتماعی توبہ ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا وعدہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَاَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾﴾ اللہ تعالیٰ اِن آیات کی برکت سے ہمیں فوری طور پر انفرادی توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے اپنا تن' من' دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشے

اب مجھے اب تک کی گفتگو کے حوالے سے کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنی ہیں۔ پہلی بات تو یہ سامنے آ گئی کہ اسلام اصلاً دین ہے' صرف مذہب نہیں۔ لیکن جیسا کہ گفتگو کے آغاز میں عرض کیا گیا' دنیا میں آج جو تصور کارفرما ہے اور بین الاقوامی سطح پر جس تہذیب کا غلبہ ہے اور جو حقائق اب درجہ بدرجہ منکشف ہو رہے ہیں' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی گہری سازش اور پلاننگ کے تحت ایک مخصوص فکر کو پھیلایا گیا ہے اور اس فکر کو ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''Novo Ordus Seclorum'' کے الفاظ امریکہ کے ایک ڈالر کی مالیت کے نوٹ پر بھی کندہ ہیں۔ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا خاکہ درحقیقت ۱۷۷۱ء میں تیار کیا گیا تھا' جس کے مطابق دنیا کے اندر سوچ کے رُخ کو ایک خاص انداز میں ڈھالا گیا اور اس میں یہ بات شامل کی گئی کہ مذہب سے اجتماعی زندگی کا تعلق منقطع کر کے تمام مذاہب کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ عام طور پر انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' پھر ہر حصہ تین ذیلی حصوں پر مشتمل ہے۔ انسانی زندگی کے جو یہ چھ گوشے (۳+۳) مانے جاتے ہیں ان میں سے تین کا تعلق انفرادی اور بقیہ تین کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ جو گوشے انسان کی انفرادی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں وہ ''عقیدہ' عبادات اور کچھ

معاشرتی رسومات'' پر مشتمل ہیں۔ عقیدہ کے ضمن میں کوئی ایک خدا کو مانے' ہزار کو مانے یا کسی کو نہ مانے' سیکولرزم کی رُو سے ہر فرد یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوگا۔ اسی طرح مراسمِ عبودیت کی ادائیگی کس طریقے سے ہوگی' آیا مسجد میں جانا ہے' مندر میں' چرچ میں یا کہیں بھی نہیں' یہ بھی ہر فرد کا انفرادی معاملہ ہوگا۔ انفرادی زندگی کا تیسرا گوشہ معاشرتی رسومات (social customs) سے بحث کرتا ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش پر کیا رسومات ادا کرنی ہیں؟ شادی کن رسوم و رواج کے مطابق ہوگی؟ نکاح ہوگا' یا پھیرے ڈلوائے جائیں گے یا گرجے میں جانا ہوگا وغیرہ۔ اسی طرح کسی فرد کی موت کی صورت میں میت کی تدفین ہوگی یا اسے جلایا جائے گا یا گِدھوں اور چیلوں کو کھلا دیا جائے گا' سیکولرزم میں یہ تمام معاملات افراد کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے۔

یہ تو تھے انفرادی زندگی کے تین گوشے جن کی کچھ تفصیل میں نے آپ کے سامنے رکھی۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے بھی تین ہی گوشے ہیں جو معاشرتی' معاشی اور سیاسی نظام سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن سیکولرزم یا نیو ورلڈ آرڈر کی رُو سے اجتماعی زندگی کے اِن تینوں گوشوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یہ تو افراد اپنی کثرتِ رائے سے' اپنے نمائندوں کے ذریعے قانون سازی کر کے طے کریں گے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مثال کے طور پر کسی معاشرے میں شراب محض اس لیے حرام قرار نہیں دی جا سکے گی کہ اسلام میں حرام ہے۔ اسی طرح کسی اور مذہب میں کوئی اور چیز حرام ہے تو اُس پر بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکے گی' البتہ کثرتِ رائے سے اگر فیصلہ ہو جائے تو اسے حرام قرار دیا جا سکے گا۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ دو مرد اگر اپنی جنسی خواہش ایک دوسرے سے پوری کرنا چاہیں اور میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو کثرتِ رائے سے ایسا قانون بن سکتا ہے۔ گویا اجتماعی زندگی میں قانون سازی عوام کی کثرتِ رائے سے اس کے نمائندوں کے ذریعے عمل میں آئے گی' اور یہی دراصل سیکولرزم ہے۔

انسانی زندگی کے کُل چھ گوشے قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں' یعنی تین انفرادی اور تین اجتماعی۔ البتہ نوٹ کیجیے یہاں درمیان میں ایک

اہم چیز اور آتی ہے جو اِس وقت دنیا میں مابہ النزاع بنی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو وہ انفرادی ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق اجتماعیت سے بھی جڑتا ہے' اور وہ ہے عائلی قوانین (family laws)—— عائلی قوانین اس اعتبار سے انفرادی زندگی کا حصہ بنتے ہیں کہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کے لیے آیا نکاح کرنا ہے' پھیرے ڈلوانے ہیں یا چرچ میں شادی کی رسومات ادا کرنی ہیں' یہ فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ اجتماعیت کا نقطۂ آغاز بھی تو ہے۔ معاشرت اور اجتماعیت کی پہلی اینٹ تو یہی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر کسی مذہب کا عمل دخل قبول کر لیا جائے تو سیکولرزم کی رو سے یہ گویا مذہب کی طرف سے اجتماعیت کے اندر نقب لگانے کے مترادف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں ایک کامن سول کوڈ (Common Civil Code) ہونا چاہیے' اور یوں یہ معاملہ بھی مذاہب کے زیر اثر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اگر آپ امریکہ میں رہ رہے ہیں تو شادی بیاہ کے ضمن میں وہاں آپ پر امریکی قوانین کی پابندی لازمی ہے' خواہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ اور یہی کشمکش اب بھارت میں بھی جاری ہے۔ ہندوؤں کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طور بھارتی مسلمانوں کے عائلی قوانین کو ختم کر کے ایک کامن سول کوڈ کا اطلاق کیا جائے' جو اُن کے نزدیک قومی یکجہتی کے لیے ناگزیر ہے۔ گویا یہ کوشش پورے شدّ ومدّ سے جاری ہے کہ اس سے پیشتر کہ مذہب اجتماعی زندگی میں کچھ نقب لگائے' کیوں نہ سیکولرزم کو مذہبی زندگی اور گھر کے دائرے کے اندر نقب لگانے کا موقع فراہم کیا جائے اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی مذہب کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا اِس وقت ایک بڑی گہری سازش کے تحت اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ مذہب کو انفرادی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ اور یہ بات انسانی ذہنوں کے اندر اس طرح اُتار دی گئی ہے کہ پوری دنیا اسی اصول پر کارفرما ہے۔ مسلمان بھی بظاہر اسلام کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن درحقیقت اسلام کو مذہب مانتے ہیں' دین نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں زندگی کا کوئی بھی

گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام کو دین کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو۔ بس کچھ مراسمِ عبودیت کی پابندی ہے۔ مسجدیں اچھی سے اچھی بن جائیں گی۔ رمضان کے دوران روزے کے احکامات کے ضمن میں کچھ سختی سے عمل نظر آ جائے گا۔ گویا اسلام کو ہم نے صرف کچھ مراسمِ عبودیت اور سماجی رسومات تک محدود کر دیا ہے۔ جبکہ اجتماعی زندگی کا نقشہ ہمارا ابھی وہی ہے جو غیر مسلموں کا ہے۔ یہی دراصل سیکولرزم ہے جو اِس وقت پوری دنیا کا دین ہے۔ اگرچہ کچھ احیائی تحریکوں کے ذریعے یہ کوشش تو کی جا رہی ہے کہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پیش کیا جائے، لیکن فی الواقع دنیا میں کہیں بھی اسلام بحیثیت دین موجود نہیں ہے، بلکہ صرف ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام مذہب نہیں ہے۔ اسلام میں مذہب بھی ہے۔ اس کے مسلّمہ عقائد ہیں، جیسے توحید، ایمان بالرسالت، فرشتوں پر ایمان، آخرت کا عقیدہ۔ اس میں عبادات کا نظام ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ پھر اس کے معاشرتی قوانین ہیں۔ سماجی برائیوں (social evils) کا تصور ہے جنہیں ختم کرنا ہے۔ سماجی اقدار (social values) کا تصور ہے جنہیں عام کرنا ہے۔ اس میں شادی بیاہ ہے، عقیقہ ہے، نمازِ جنازہ ہے، تجہیز و تکفین ہے۔ اس کے اپنے بھرپور اور مکمل عائلی قوانین ہیں، جنہیں مسلمانانِ پاکستان نے قومی سطح پر بحیثیت مجموعی مسترد کر رکھا ہے، جبکہ بھارتی مسلمان ان کے دفاع میں آج تک ڈٹا ہوا ہے۔ وہ کب تک ڈٹا رہے گا، میں یہ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ وہاں پر حالات بڑی تیزی سے ایک دوسرے رُخ پر جا رہے ہیں۔ بہرحال ہمارے مقابلے میں ان کا پلڑا اس اعتبار سے بھاری ہے کہ انہوں نے جدید تہذیب کو اپنے عائلی قوانین میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دی، جبکہ ہمارے ہاں جدید مغربی فکر عائلی قوانین کے اندر بھی نقب لگا چکا ہے۔

۱۹۶۲ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعے یہاں غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ کر دیے گئے، پھر انہیں قانونی حیثیت دے دی گئی۔ تمام مکاتیبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے انہیں غیر اسلامی قرار دیا۔ ان میں سے چند نام ملاحظہ کیجیے: امیر جماعتِ اسلامی سید

ابوالاعلیٰ مودودی، اہل تشیع میں سے مفتی جعفر حسین مجتہد اور حافظ کفایت حسین، بریلوی علماء میں سے مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا محمود احمد رضوی، دیوبندی علماء میں سے مفتی محمد شفیع صاحب، اہل حدیث حضرات میں سے حافظ عبداللہ روپڑی۔ تمام مکاتیبِ فکر کے علماء نے کہا کہ یہ قوانین غیر اسلامی ہیں، لیکن ایک فوجی آمر نے انہیں نافذ کیا اور وہ آج تک نافذ ہیں، ان میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ اس دوران گیارہ برس پر محیط ''اسلامی مارشل لاء'' بھی گزر گیا اور اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بھی، لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام دین ہے اور مذہب اس کا ایک جزو ہے۔ اور جب تک ہم اسے دین کی حیثیت سے تسلیم اور نافذ نہیں کریں گے ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں۔ ہمارا مُنہ نہیں کہ ہم اللہ سے مخاطب ہوں، اس سے دعا کریں، مخاطبہ اور مکالمہ کریں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

> ﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط﴾ (المائدۃ:٦٨)
>
> ''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم کسی شے پر نہیں ہو (تمہارا کوئی مقام نہیں ہے) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے اور اُس کو جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے ربّ کی طرف سے''۔

قرآن حکیم میں یہ خطاب اہل کتاب سے ہے، لیکن اسی طرح کا معاملہ ہمارا بھی ہے۔ بہر حال اِس وقت دنیا میں اسلام ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

دوقومی نظریہ اور علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد

اِس صورت حال میں بیسویں صدی کے دوران ایک بہت بڑی انقلابی تبدیلی کی کوشش ہوئی، جس کی بنیاد ''دوقومی نظریہ'' تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب ہر طرف سیکولرزم کا چرچا تھا۔ پوری دنیا کی فضا متحدہ وطنی قومیت (Territorial Nationalism) کے نعرے سے گونج رہی تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم ہیں اور مذہب ان کا

انفرادی معاملہ ہے۔ اُس وقت برعظیم میں ایک آواز اٹھی جو نہایت زوردار تھی۔ اگرچہ اس کے دیگر مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب بھی تھے' لیکن جس چیز نے اسے ایک تحریک کی شکل دی وہ علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد تھا' جس میں انہوں نے فرمایا کہ اسلام ایک دین ہے' جس پر دورِ ملوکیت میں بہت سے پردے پڑ گئے' اور یوں اسلام کا اصل نظام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم کشاکش کا حل بھی یہی ہے کہ اس خطے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے' ایک مسلمان اور دوسرا ہندو اکثریت کا علاقہ۔ اس سے جہاں ان دونوں قوموں میں منافرت اور کشاکش ختم ہو گی وہیں دونوں قوموں کو موقع مل جائے گا کہ اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں۔ اس کے برعکس اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا ہے تو مسلمان ایک غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ اور اس صورت میں وہ اپنے نظام کو بروئے کار لانے کی پوزیشن میں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کے لیے ایک ایسا خطہ چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ہو۔ اس طرح انہیں یہ موقع میسر آ جائے گا کہ عرب شہنشاہیت کے دَور میں اسلام کے چہرے پر جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے' تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام نوعِ انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ بات زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ نظریۂ پاکستان کے ضمن میں علامہ اقبال کے مذکورہ خطبہ کو لوگوں کے سامنے اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ یہ وہ دَور تھا جب خود قائداعظم بھی اپنے چودہ نکات سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ابھی تک وہ اس کوشش میں تھے کہ ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا یہ تو علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد تھا جس نے تحریک پاکستان کو ایک نیا رُخ' نئی سوچ' نئی امنگ اور ایک نیا تصور دیا۔ اگرچہ مذکورہ خطبے میں لفظ پاکستان نہیں تھا' لیکن علامہ اقبال کے الفاظ "At least in the north west of India" اسی خطۂ ارضی کی نشان دہی کر رہے تھے جسے آج بھی دنیا

''پاکستان'' کے نام سے جانتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ''دین'' کا ایک وسیع تصور تھا اور وہ سیاست کو بھی دین کا حصہ سمجھتے تھے ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ وہ چاہتے تھے کہ اس خطۂ ارضی میں اسلام مذہب کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دین کی حیثیت سے نافذ ہو۔ یہ ایک نعرۂ مستانہ تھا، جس کے فروغ کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ذریعہ بنایا: ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

فکری اعتبار سے علامہ اقبال کا مذکورہ خطبہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا جو سیکولرزم کی نفی پر مبنی تھا، جس کا اُس وقت بھی پوری دنیا پر غلبہ تھا اور آج بھی ہے۔ یہ دنیا کی سیکولر فضا میں ایک نعرۂ مستانہ تھا کہ وہ اسلام جو دورِ ملوکیت کے پردے پڑنے سے پہلے، یعنی خلافت راشدہ کے دَور میں تھا، اُس کا نمونہ دنیا کے سامنے لایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے، کیونکہ نوعِ انسانی کا قافلہ کسی آئیڈیل نظام کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ انسان مختلف تجربات کرتا ہے، لیکن ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچیے، نوعِ انسانی کی کتنی مساعی صرف ہوئی، کتنے انسانوں نے خون دیا، کتنی جدوجہد ہوئی، جب کہیں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا، لیکن آج وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر، بلکہ موم کے بنے ہوئے گھر (house of wax) کی طرح پگھل کر رہ گیا اور وہ ساری محنت اور جدوجہد اکارت گئی۔ یہ کتنے بڑے پیمانے پر نوعِ انسانی کا اجتماعی ضیاع اور نقصان ہے! غور کیجیے ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ جو اصل ہدایت تھی اس پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں اور جو اِس ہدایت کے علم بردار ہیں وہ خود اوروں کے پرستار بنے ہوئے ہیں اور اپنے نظام کے اوپر پردے ڈال کر بیٹھے ہیں، بلکہ یوں کہیے خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں، جو نہ تو خود اس سے کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو قریب آنے دیتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت

بڑا انقلابی مشن تھا جس کو نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے‘ اور اس کے ضمن میں علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کی طرف از سرِ نو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تقسیمِ ہند کا حاصل؟

اس سارے منظر نامے میں‘ جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا‘ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ حاصل کیا ہوا؟ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہر چیز کی نفی کر دینا بھی انتہا پسندی ہے۔ جو چیز حاصل ہوئی ہے اس کو سمجھ لیجیے۔ اس لیے کہ اگر پورا ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا تو اس صورت میں اسلام کے اس اجتماعی نظام کے بروئے کار آنے کا امکان تقریباً صفر کے درجے میں ہوتا۔ میں ’’تقریباً‘‘ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی کلیۃً نفی بہر حال نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ نے فردِ واحد سے دعوت کا آغاز کر کے انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن یہ کہ برعظیم کے زمینی حقائق کے پیشِ نظر اِس بات کا امکان تقریباً صفر تھا کہ یہاں اسلام ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے آ سکے۔

بہرحال جدوجہدِ آزادی کے نتیجے میں ابتداءً دو ملک وجود میں آ گئے۔ ایک ملک میں غالب اکثریت مسلمانوں کی اور دوسرے میں ہندوؤں کی تھی۔ یوں دونوں کو یہ موقع میسر آ گیا کہ اپنی اکثریت کی بنیاد پر اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری　　سرودے‘ نالۂ‘ آہے‘ فغانے!

اِس صورتِ حال میں مسلمانوں کو یہ سنہری موقع مل گیا کہ اپنی غالب اکثریت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کو دکھا دیں۔ اس کا ایک امکان پیدا ہوا۔ لیکن بعد میں جو صورت حال بنی اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا اور بنگلہ دیش ایک الگ ملک کی حیثیت سے وجود میں آ گیا۔ اس طرح دو کی بجائے تین ملک ہو گئے اور تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کا جو نسبت تناسب تھا وہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ اس تناظر میں بنگلہ دیش ایک ایسا ملک ہے جس میں مسلمان اکثریت میں تو ہیں لیکن ایسی فیصلہ کن اور غالب اکثریت میں نہیں کہ اُن سے اس اصول کی بنیاد پر کوئی

زیادہ توقع کی جاسکے۔ البتہ مغربی پاکستان وہ ملک ہے جہاں کم ازکم نام کے مسلمان اور ایمان کے مدعی اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں کہ اگر یہ بالفعل چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو نظامِ اسلام کے قیام کے معاملے میں ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکے۔ گویا پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی ذمہ داری کا بوجھ اب ہمارے کندھوں پر آ گیا ہے۔ لہٰذا اگر اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت کے باوجود بھی ہم یہاں اسلام کا نظام قائم نہیں کرتے تو پھر ہم سے بڑا بدنصیب‘ اللہ کا باغی اور مجرم کون ہوگا؟

قائداعظم اور سیکولرزم

آگے بڑھنے سے قبل میں قائداعظم کے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کے متنازعہ جملے کے بارے میں ذرا وضاحت کرنا چاہتا ہوں‘ جس کے بارے میں مَیں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ کاش وہ یہ الفاظ نہ کہتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک ان کے اس جملے کی ایک توجیہہ بھی ہے‘ کیونکہ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ قائداعظم ایک راست باز انسان تھے‘ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ یہ صرف میرا تاثر نہیں ہے‘ بلکہ ان کے بدترین ناقدین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ ایک راست رَو (straight forward) اور دیانت دار آدمی تھے‘ ان کے قول وفعل میں تضاد نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کم ازکم یہ کام تو کر دکھایا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا‘ ورنہ ہندوستان اگر ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو اس میں نظامِ اسلام کے دین کی حیثیت سے قیام کا تقریباً کوئی امکان نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ایک بہت بڑی کامیابی (achievement) ہے جو مسلم لیگ کے ذریعے ایک خطۂ ارضی کے وجود میں آنے کی صورت میں حاصل ہوئی کہ یہاں مسلمان ایسی غالب اکثریت میں ہیں کہ وہ مروّجہ جمہوری اصولوں کے تحت یہاں اسلام قائم کر سکتے ہیں۔ متذکرہ بالا جملے سے قائداعظم کا منشا یہی تھا کہ یہاں ہمیں اسلام لانے کے لیے سیاسی اور جمہوری راستہ اختیار کرنا چاہیے‘ بجائے اس کے کہ ہم جذباتی نعرہ بازی کے ذریعے پوری دنیا کو چوکنا کر دیں۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہوسکتا تھا کہ بنیاد پرستی (fundamentalism) جو آج ایک گالی بنادی گئی ہے‘

شاید اُسی وقت بنا دی جاتی اور دنیا کی ساری سیکولر قوتیں اُسی وقت "Nip the evil in the bud" کے مصداق پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے قائداعظم نے breathing space حاصل کی کہ جب ہم ایک مقصد جمہوری اصول کے تحت حاصل کر سکتے ہیں اور سیکولرزم بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتا تو مذہب کی بجائے اکثریت کی بنیاد پر اسلام کا نظام لایا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب ''استحکام پاکستان'' میں قائداعظم کے محولہ بالا جملہ کی توجیہہ اِن الفاظ میں پیش کی ہے:

''راقم کے نزدیک قائداعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا۔ اس لیے کہ قائداعظم مرحوم خواہ ایک ''مذہبی شخصیت'' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاست دانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی' سیرت کی پختگی' ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں۔ اسی طرح اُن کا وہ متنازع جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متأثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا' اس لیے کہ قائداعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے' بلکہ وہ واقعتاً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک اُن کے اس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق موقف کے ساتھ اس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اوّلاً برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب' تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہو گئی' اور ان چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِّ باب ہو گیا' ثانیاً پاکستان میں واقعتاً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیش نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں' واقعتاً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتاً اور واقعتاً اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے

خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے ''اجتماعی ارادے'' (collective will) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی' لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دار و مدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے' لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتاً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائداعظم کی اس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اس طریق کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے' لیکن اس توجیہہ سے وہ سارے اشکال حل ہو جاتے ہیں جو اس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں' اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے' نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا۔ **هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہ!**''

ہماری مذہبی جماعتوں کا طرزِ عمل

البتہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بالفعل ہوا کیا ہے۔ بدقسمتی سے اسی تصور کو ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی عملاً اختیار کر لیا۔ یہ حضرات قائداعظم کے اس موقف کے حوالے سے انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں' لیکن عملاً وہی کچھ کر رہے ہیں' یعنی وہی جمہوری اور انتخابی سیاست۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ مجھے اس طریق کار سے اختلاف کیوں ہے؟ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر مسئلہ صرف مذہب کا ہوتا تو اسلام بطور مذہب تو بھارت میں بھی تا حال موجود ہے۔ ایک دو مسجدوں میں جھگڑا ہو جانا یا جن علاقوں میں مسلمان بالکل ختم ہو گئے وہاں کی مساجد کا اصطبل بنا دیا جانا ایک دوسری بات ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں مساجد پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اسی طرح اسلام بطور مذہب تو امریکہ میں بھی ہے۔ اصل مسئلہ ہے اسلام بطور دین اور نظام کا۔ اور یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ نظام انتخابات کے ذریعے کبھی تبدیل نہیں ہوسکتا۔ نظام تو

ہمارے ہاں جاگیرداری کا ہے۔ اسلام کے حوالے سے بھی اس نظام میں ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو دورِ ملوکیت کی طرح آج بھی قائم و دائم ہیں۔ وہی مسلمان جاگیرداراور سرمایہ دار آج بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا :؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

چنانچہ جب یہ طرزِ عمل ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی اختیار کرلیا تو سارا فساد یہیں پیدا ہوا۔ اس کا جو صغریٰ کبریٰ بنا وہ یہ ہے کہ اصل معاملہ نظام کا ہے' لیکن نظام انتخابات کے ذریعے بدل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ ووٹ تو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی گرفت میں ہیں اور جاگیردار کے خلاف ووٹ کون اور کیسے دے گا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے' اور یہی ہوتا بھی رہا ہے' کہ ایک جاگیردار کے مقابلے میں دوسرے کو لے آئیں۔ ایک قریشی کے بجائے دوسرا قریشی' ایک گیلانی کے بجائے دوسرا گیلانی اور ایک مزاری کے بجائے دوسرا مزاری آجائے۔ اسی طرح قیاس کرتے چلے جائیے۔ چونکہ موجودہ نظام کے تحت پھندے میں پھنسا ہوا ووٹ اس کے خلاف نہیں جا سکتا' لہٰذا نظام الیکشن کے ذریعے تبدیل کرنا ناممکن ہے۔

اس سارے منظر نامے میں جب ہماری مذہبی جماعتوں نے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو نظام کی بات انہیں خود چھوڑنی پڑی۔ میں کسی ایک جماعت کا نام نہیں لے رہا۔ اس راستے میں یقیناً کچھ لوگوں نے اوّلین پیش قدمی کی ہے اور کچھ ان کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ کچھ آگے بڑھے ہیں' کچھ ان کے پیچھے آئے ہیں۔ میں اِس وقت کسی کو علیحدہ نہیں کر رہا' بلکہ جن مذہبی جماعتوں نے یہ سمجھا کہ الیکشن کے ذریعے وہ یہاں اسلام لا سکتے ہیں اُن کے مجموعی طرزِ عمل کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ ہماری مذہبی جماعتوں کے اس طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس دَور میں جاگیرداروں کو راضی کرنے کے لیے ایسی

کتابیں لکھی گئیں جن کے ذریعے انہیں اطمینان دلانے کی سعی کی گئی کہ اسلام میں جاگیرداری بھی ہے اور زمینداری بھی۔ کیونکہ ہماری مذہبی جماعتیں یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ سارا معاملہ تو اِن (جاگیرداروں اور زمینداروں) کے ہاتھ میں ہے' لہٰذا اگر یہ طبقات نہ چاہیں تو ہمارے لیے اقتدار کا راستہ کیسے ہموار ہوگا۔ یوں ہماری مذہبی جماعتوں نے اپنے آپ کو دورِ ملوکیت والے اسلام کے علمبردار کے طور پر پیش کیا جس نے جاگیرداری اور زمینداری کو برقرار رکھا ہے۔ اس طرح گویا جاگیرداروں اور زمینداروں کو یہ یقین دلایا گیا کہ ہم بھی اسے برقرار رکھیں گے۔ حالانکہ پیش نظر تو یہ تھا کہ الیکشن کے ذریعے اگر اقتدار مل جائے تو اسلامی نظام لے آئیں گے۔ لیکن اس بنیادی غلطی کے سبب سارا صغریٰ کبریٰ غلط ہوگیا۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ الیکشن کے ذریعے نظام نہیں بدلا جا سکتا تو طے یہ ہوا کہ نظام پر تو انگلی مت اٹھاؤ' بلکہ جاگیردار اور زمیندار طبقے کو یہ اطمینان دلاؤ کہ ہمارے بارے میں کوئی اندیشے نہ رکھو۔ یوں ہوتے ہوتے بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہوکر رہ گئی۔ رہا نظام جس کے لیے یہ ساری تگ ودَوتھی' نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اب جبکہ بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہوکر رہ گئی' تو اِس صورت حال میں کچھ لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ قانونِ شریعت کے نام پر کچھ ادھورے قسم کے اقدامات کیے گئے یا محض کچھ لیبل تبدیل کر دیے گئے۔ جیسے یہاں زکوٰۃ کا نفاذ عمل میں آیا' سود کا نام تبدیل کر کے مارک اپ رکھ دیا گیا' سیونگ اکاؤنٹ کو پی ایل ایس کا نام دے دیا گیا اور حدود آرڈی نینس کا نفاذ ہوگیا وغیرہ۔ یوں قانون کا چہرہ کسی درجے میں تبدیل کر دیا گیا' رہا نظام تو وہ صدفی صد جوں کا توں رہا۔ کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کم از کم داغ تو پڑ جاتا ہے' لیکن یہاں تو موجودہ نظام پر کوئی داغ تک نہیں پڑا' وہ جوں کا توں موجود ہے۔ یہ ہے اصل میں اس سارے طرزِ عمل کا نتیجہ جو پاکستان میں نکلا۔

بھارتی مسلمانوں کی غلط حکمتِ عملی

اِس صورت حال کا مداوا کس طرح ہوسکتا ہے اور ہمارے کرنے کا اصل کام کیا

ہے' اس بارے میں عرض کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ بھارت کے مسلمانوں نے اس سے بھی بڑھ کر غلطی کی کہ انہوں نے ہندو کے غلبے کے خوف کی بنیاد پر سیکولرزم کو بطور ڈھال اختیار کر لیا۔ اگرچہ ہمارا مُنہ نہیں ہے کہ ہم انہیں کوئی مشورہ دیں' بلکہ بہت سے مواقع پر سعودی عرب' امارات اور امریکہ میں مقیم بعض بھارتی مسلمانوں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران جب کوئی مشورہ مانگا تو میرا جواب یہی تھا کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی مشورہ آپ کے گوش گزار کریں' آپ کے جو بھی حالات ہیں اور جن مسائل اور مشکلات کا آپ شکار ہیں اُن کے پیشِ نظر ہمارے پاس تو آپ کے لیے بجز ندامت کے جذبات کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ کی cost پر ہم پاکستان میں عیش کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو ہندو کے پاس یرغمال بنوایا اور خود گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں۔ پاکستان جس مقصد کے لیے بنایا تھا وہ ہم نے پورا نہیں کیا۔ آپ نے تو پاکستان بنوا کر ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک موقع فراہم کر دیا تھا' گویا ایک درجے میں آپ اپنا فرضِ کفایہ ادا کر چکے۔ چنانچہ ہم تو آپ کے مجرم ہیں۔ لیکن یہ کہ اب میرا بھارت آنا جانا کچھ زیادہ ہوا ہے اور وہاں بعض مشاہیر اکابرین سے میری جو گفتگوئیں ہوئی ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ بات ان سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک جتنی باتیں بھی میں نے ان کے سامنے رکھی ہیں' ماسوائے ایک دو استثناء ات کے' کسی کو اس بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں پایا۔ لیکن جو بات صحیح ہو وہ کہنی تو بہرحال ضرور چاہیے۔ کیا عجب آج کسی کے دل میں بیج پڑ جائے' جو کل ظاہر ہو جائے۔ اس کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بھارتی مسلمانوں نے اس خوف کے سبب کہ ہندو اکثریت کی بنیاد پر بھارت میں رام راج آ سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمان ملیچھ ہو جائے گا اور یوں اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی' سیکولرزم کو ایک ڈھال کے طور پر اختیار کر لیا' حالانکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سیکولرزم تو اسلام کی نفی ہے۔ آپ کسی نظام میں مجبور ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ جیسے بنی اسرائیل آلِ فرعون کے عذاب کی چکّی

میں پِس رہے تھے۔ لیکن خود کسی غیر اسلامی نظام کو ذہناً قبول کر کے اُس کے علَم بردار بن جانا درحقیقت بہت بڑی بنیادی فکری غلطی ہے۔ اور یہی غلطی بھارتی مسلمانوں سے مصلحت کے تحت ہوئی کہ ان کے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے سیکولرزم کا سہارا لے کر قومی سیاست میں شمولیت اختیار کر لی اور اس طرح متحدہ قومیت کے نظریے کو بالفعل تسلیم کر لیا۔ حالانکہ پاکستان بنانے میں بھارتی مسلمانوں نے جو حصہ لیا وہ اس اصول کی بنیاد پر تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں' ورنہ تحریکِ پاکستان میں اُن کا حصہ لینا بے معنی تھا۔ ایک الگ قوم ہونے کی حیثیت سے جداگانہ قومی تشخص ایک علیحدہ شے ہے' جبکہ علاقائی وطنیت (Territorial Nationalism) اور سیکولرزم ایک بالکل دوسرا دین ہے۔ ان دونوں میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ مناسبت۔

درحقیقت ہونا یہ چاہیے تھا کہ بھارت کے مسلمان اپنے اسی موقف پر قائم رہتے ہوئے کہ ہم علیحدہ قوم ہیں اور عظیم تر ہندی قومیت کا جزو نہیں ہیں' اپنے لیے ان اقلیتی حقوق کی گارنٹی مانگتے جو دنیا میں اقلیتوں کے مسلّمہ حقوق ہیں' اور اگر اس ضمن میں ان کے حقوق کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو اس کے تحفظ کے لیے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے سیکولرزم کو ڈھال بنا کر اور متحدہ قومیت کے نظریے کو ذہناً' عقلاً اور عملاً قبول کر کے بھارتی مسلمانوں نے آج تک پایا تو کچھ نہیں' لیکن کھویا بے پناہ ہے۔ جو کچھ پایا ہے وہ ایجی ٹیشن کے راستے سے ہی پایا ہے۔ ''شاہ بانو کیس'' میں بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کے ضمن میں دراندازی کرتے ہوئے طلاق کے قانون میں صرف ایک اضافہ کر دیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک مطلقہ عورت کی دوسری شادی نہ ہو جائے یا اُس کا انتقال نہ ہو جائے' اس کا نان نفقہ سابقہ شوہر کے ذمہ رہے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگر مطلقہ عورت کسی وجہ سے دوسری شادی نہ کرنا چاہے اور سابقہ شوہر اُس کی مالی معاونت کرنا چاہے تو اسلام اس سے روکتا نہیں۔ لیکن سابقہ شوہر یہ سب کسی پابندی کے بغیر تبرّعاً اور رضا کارانہ طور پر کرے گا۔ اس ضمن میں اسلام سابقہ شوہر پر کوئی پابندی عائد

نہیں کرتا‘ لہٰذا ایسا کوئی فیصلہ اسلام کے عائلی قوانین میں دراندازی کے مترادف تصور کیا جائے گا۔ اسلام میں شوہر کی ذمہ داری صرف عدت پوری ہونے کی حد تک ہے‘ جیسے ہی عدت پوری ہوئی اور علیحدگی عمل میں آ گئی تو سابقہ شوہر کی ذمہ داری ختم ہوجائے گی۔ سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا فیصلے کے خلاف بھارتی مسلمانوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ تشکیل دے کر احتجاجی تحریک چلائی‘ جلسے کیے‘ جلوس نکالے‘ جس کے نتیجے میں گولیاں بھی چلیں اور مسلمانوں نے جانیں بھی دیں‘ یہاں تک کہ اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے‘ اور یہ قانون بن گیا کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں بھارت کی کوئی عدالت دخل نہیں دے سکتی۔ تاریخی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت بڑی کامیابی اور achievement تھی جو مسلمانانِ ہند کو ایجی ٹیشن کے راستے سے حاصل ہوئی۔ الیکشن کے راستے سے تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ الیکشن کے ذریعے کتنے مسلمان بھارتی پارلیمنٹ میں آ سکتے ہیں؟ پورے بھارت میں ماسوائے دو یا تین سیٹوں کے ایک بھی یقینی مسلم سیٹ نہیں ہے۔ لہٰذا کہیں بھی مسلمان اپنے ووٹ کے بل پر الیکشن نہیں جیت سکتے۔ نتیجتاً کسی بھی سیکولر پارٹی‘ خواہ وہ کانگریس ہو یا جنتا دل‘ سے مفاہمت کر کے انہی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا پڑے گا اور یوں ان پارٹیوں کے پورے نظریے‘ فلسفے اور منشور سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا جداگانہ تشخص ختم ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کے سبب بھارت میں ایک خاص کلچر فروغ پا رہا ہے۔ اونچے طبقے میں تو ہندو مسلم کلچر آپس میں گھل مل گئے ہیں اور اسلامی کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوامی سطح پر بھی بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور دانشور‘ صحافی‘ سیاست دان سبھی سیکولرزم کو ہی اصل حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ گویا اسلام ایک دین کی حیثیت سے قصۂ ماضی بنتا جا رہا ہے۔ بقول اکبرالٰہ آبادی: ؎

میرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو!
ہنس کے وہ بولیں کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!

اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ تو یہی نکلے گا اور ہندو اکثریت اسی پر راضی ہو جائے گی۔ اب جھگڑا اور کس بات کا ہے؟ رہا مسلمانوں کے مسجدوں میں جانے کا معاملہ تو اس پر نہ تو پہلے کوئی پابندی تھی نہ اب کوئی اعتراض ہوگا۔ مقبروں اور مزاروں کی تو ہندو خود بھی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ مَیں خود گزشتہ دورۂ بھارت کے دوران حصار میں دیکھ آیا ہوں' جہاں ایک بہت بڑے نقشبندی بزرگ مظفر علی خان کی قبر ہے' جس کا بڑے احسن طریقے سے خیال رکھا جا رہا ہے' حالانکہ اس علاقے میں ایک بھی مسلمان آباد نہیں۔ جس کمرے میں یہ قبر واقع ہے اس کے طاقوں میں ہندوؤں نے اپنے بُت بھی سجا رکھے ہیں۔ مزاروں اور قبروں کی بےحرمتی تو وہ بھی نہیں کرتے' بلکہ وہ تو مزاروں کی زیارتیں بھی کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں کہ بھارت میں مسلمانوں کے ووٹ کے استعمال نے آج تک منفی نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ایک الیکشن میں نس بندی کے ایشو پر مسلمانوں کا ووٹ تقریباً یکجا ہو کر اندرا گاندھی کے خلاف کاسٹ ہو گیا تھا' جس کے سبب اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے الیکشن میں اس نے ہندی کارڈ کو play کیا اور یوں ہندو جذبات کو اپیل کر کے وہ جیت گئی۔ اسی سے یہ بی جے پی کا سارا ہنگامہ کھڑا ہوا' ورنہ اس سے پہلے تو بھارتیہ جنتا پارٹی کی بھارتی سیاست میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے ووٹ کے ذریعے اس قدر مؤثر ہو سکتا ہے تو انہوں نے اکثریتی ووٹ کو ہندومت کے نام پر اپیل کیا۔ اس کے بھارتی سیاست پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے اور بی جے پی' جس کی سیاسی حیثیت اس سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھی' ایک بھرپور سیاسی قوت بن کر ابھری اور یوں مسلمانوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ گویا بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہو گیا۔

بھارتی مسلمانوں کی خدمت میں چند گزارشات

یہ تو تھا وہ تجزیہ جو بھارتی مسلمانوں کے طرزِ عمل کے حوالے سے میں نے آپ

کے سامنے رکھا۔ اس صورت حال میں کیا خطرات مضمر ہیں' ان کے حوالے سے اب مجھے کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔ گو یہ باتیں بظاہر باریک اور چھوٹی چھوٹی نظر آتی ہیں' لیکن بسا اوقات یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے دانشوروں کے لیے بھی سمجھنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ ان باتوں کے لیے لوگوں کے سینوں کو کھول دے۔ اس ضمن میں مَیں آپ کی توجہ ایک مرتبہ پھر علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں' جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ سیکولرزم ہندو کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہندو کوئی قوم ہیں ہی نہیں۔ ہندوؤں میں تو چار ورن برہمن' کھشتری' ویش اور شودر ہیں۔ ان کے درمیان تو ایسے ایسے فاصلے ہیں جن کو عبور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جو برہمن پیدا ہوگا وہ برہمن ہی مرے گا۔ اسی طرح جو کھشتری' ویش یا شودر پیدا ہوگا وہ کھشتری' ویش اور شودر ہی مرے گا۔ لہٰذا وہ ایک قوم کیسے ہو جائیں گے؟ اسی وجہ سے انہیں ایک قوم بننے کے لیے سیکولرزم کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس مسلمان تو ایک قوم ہیں۔ لیکن جب مسلمان سیکولرزم کا نعرہ لگاتے ہیں تو بنیاد پرست اور انتہا پسند ہندو تنظیمیں اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ اگر مسلمان سیکولرزم کا علم بردار بن گیا ہے تو اس میں یقیناً اس کا فائدہ اور ہمارا نقصان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں انتہا پسند ہندو تنظیموں کے ذریعے سیکولرزم کے خلاف ایک تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ اس صورت حال میں' جیسا کہ عرض کیا جا چکا' بھارتی مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک اقلیت کا کردار ادا کریں۔ وہ اس بات کا واضح طور پر اعلان کریں کہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں' اور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اپنے حقوق کی گارنٹی کا مطالبہ کریں۔ اور اپنے حقوق کے ضمن میں اگر کوئی دست اندازی اور مداخلت ہو تو ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کریں۔

یہاں پر یہ بات بھی نوٹ کیجیے کہ اگرچہ عائلی قوانین کے ضمن میں مسلمانوں نے اس بات کو منوا کر چادر اور چاردیواری کا تحفظ تو کر لیا ہے' لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیکولرزم کے زیر اثر مسلمان دانشوروں کا ایک خاصا بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو

کامن سول کوڈ کا طرف دار بنا ہوا ہے۔ بہرحال اس غیر تسلی بخش صورت حال کے باوجود میں نے اپنے حالیہ سفر بھارت کے دوران وہاں کے مختلف مسلمان صحافیوں‘ سیاست دانوں اور اکابرین سے مفصل گفتگوئیں کی ہیں۔ ڈاکٹر سلمان حسینی ندوی جو مولانا علی میاں کے بڑے بھائی کے نواسے ہیں اور انہیں مولانا کے جانشین کی حیثیت حاصل ہے‘ ان سے بھی بڑی مفصل گفتگوئیں ہوئیں۔ جماعت اسلامی ہند کی چوٹی کی قیادت سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور گفتگوئیں رہیں۔ سید شہاب الدین صاحب ایک اہم مسلمان رہنما ہیں اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعے میں ان کا بڑا اہم رول ہے‘ ان سے بھی بڑی مفصل ملاقات ہوئی۔ مزید برآں دیوبندی حلقہ کے تھانوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض علماء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا ہے‘ لیکن تاحال ان کا جواب حوصلہ افزا نہیں۔ تاہم میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا۔

اس ضمن میں سب سے اہم لیکن ذرا مختلف رول جماعت اسلامی ہند کا رہا ہے۔ میں اس بات کا تذکرہ متعدد بار کر چکا ہوں کہ جماعت اسلامی جب ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تو وہ اپنے نظریات کے اعتبار سے بڑی اصولی اور انقلابی جماعت تھی۔ اس کا واضح موقف تھا کہ جہاں پر اللہ کی حکومت نہیں ہے وہ نظام طاغوت ہے‘ لہٰذا ایسے نظام کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس کا نہایت درست اور اصولی موقف تھا‘ کیونکہ اگر آپ کسی طاغوتی نظام کے تحت الیکشن میں حصہ لیں گے تو یہ طاغوت کے ساتھ تعاون کے مترادف ہے۔ ایسے نظام میں حکومت کی ملازمت اختیار کرنا بھی اس کا سہارا بننے کے ذیل میں آئے گا۔ چنانچہ تقسیم سے قبل جماعت اسلامی کے نزدیک انگریزی حکومت کی ملازمت‘ ماسوائے دو محکموں تعلیم اور ڈاک کے‘ حرام تھی۔ خاص طور پر عدلیہ کا محکمہ جہاں فیصلے غیر اللہ کے قانون کے تحت ہوتے ہوں‘ اس میں ملازمت بھی حرام تصور کی جاتی تھی اور وکالت کا پیشہ بھی۔ آج آپ کو جماعت اسلامی کا یہ موقف بڑا عجیب محسوس ہو رہا ہوگا کہ معلوم نہیں یہ کون سی دنیا کی باتیں ہیں‘ لیکن ذرا

ماضی میں جھانکئے تو آپ کو جماعت کا یہی اصولی موقف نظر آئے گا۔

تقسیم کے بعد پاکستان آ کر جماعت نے اپنی کیفیت بدلی اور اپنے اصولی موقف سے انحراف کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت کا رول اختیار کرلیا۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی ہند اپنے بنیادی اصولی موقف پر کافی عرصہ تک قائم رہی ہے اور ایک ایسے سیاسی نظام میں جہاں اللہ کی حاکمیت تسلیم نہیں کی گئی' الیکشن لڑنا حرام سمجھتی رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی اس عذر کے ساتھ ڈھیلی پڑ گئی ہے کہ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں' اب ان حالات میں کیا کریں۔ ایک طرف ہندومت کے احیاء (revivalism) کا مہیب خطرہ ہے تو دوسری طرف سیکولر طاقتیں ہیں جو کم از کم ہندو بالادستی کی تو علم بردار نہیں ہیں۔ لہٰذا اُس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ الیکشن میں تو حصہ نہیں لیا جائے گا' لیکن ووٹ دینے کی حد تک اپنے اراکین کو آزادی دے دی ہے۔ جماعت کے مختلف رہنماؤں سے جو میری گفتگو ہوئی تو ان کا کہنا یہ تھا کہ سیکولرزم کا جو مفہوم آپ لیتے ہیں وہ ہمارے اخذ کردہ مفہوم سے مختلف ہے۔ لیکن جب تفصیل سے گفتگو ہوئی تو بات وہی نکلی۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یہی تو سیکولرزم ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہی ایک ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی معاملات میں آزادی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بھارت میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت کے پیش نظر حکومت ہندو تہذیب اور کلچر ہی کا فروغ چاہے گی۔ لیکن اصولی طور پر ہندومت' اسلام' عیسائیت اور دیگر مذاہب آئین اور قانون کے اعتبار سے وہاں برابر (at par) ہیں۔

اسی طرح امریکہ میں بھی تمام مذاہب آئین اور قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہودیوں کو امریکہ میں اس درجے مؤثر ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں تو اتنی دشمنی تھی کہ ایک شخصیت (عیسیٰ علیہ السلام) جنہیں عیسائی خدا مانتے ہیں یہودی انہیں مرتد اور واجب القتل قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا چکے تھے۔ یہودی انہیں آج تک (معاذ اللہ) ولد الحرام کہتے ہیں۔ لہٰذا جب تک یہودی تمام مذاہب کو سائیڈ لائن کر کے سیکولرزم نہ لاتے تب تک اُن کے لیے ممکن ہی

نہ تھا کہ وہ یوں امریکہ پر مسلط ہو کر بیٹھتے۔ چنانچہ سیکولرزم درحقیقت یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کی رو سے مذہب اور عقیدے کو ایک طرف رکھ دیا گیا کہ یہ تو ہر فرد کا انفرادی معاملہ ٹھہرا' لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے وہ سیکولرزم کی بنیاد پر بنے گا۔ چنانچہ اسی سبب سے اُن کے لیے راستے کھلے اور اسی سیکولرزم کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں میں مفاہمت پیدا ہوئی۔ یہی کچھ بھارت میں بھی ہو رہا ہے اور ہندو کلچر اور تہذیب اسی راستے سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ تو سیکولرزم دو نہیں درحقیقت ایک ہی ہے اور یہ اسلام کی نفی ہے۔

اسلام کو ''مذہب'' بنا دیجیے تو یہ دس مذہبوں کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے' لیکن اسلام کو اگر ''دین'' مانیں گے تو ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ دین تو ایک ہی ہو گا' دو ہو نہیں سکتے۔ ایک ہی ملک میں بیک وقت اشتراکی نظام بھی ہو اور سرمایہ دارانہ نظام بھی' ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔ نظام تو کسی ملک میں ایک ہی ہو گا۔ لہٰذا اسلام کو جب آپ دین مانیں گے تو وہ کسی قسم کی شراکت گوارا نہیں کرے گا:

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

البتہ اسلامی ریاست میں ﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ) کے مصداق ہاتھ سے جزیہ دے کر چھوٹے بن کر رہنے والوں کو مذاہب کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا' دین کی حیثیت سے نہیں۔

بھارت میں تبلیغ اسلام کا صحیح منہج

بھارت کے مسلمان راہنما ایک بات یہ کہتے ہیں کہ ہندو معاشرے کی اونچ نیچ کے پیش نظر ان کے لیے یہ بڑا آسان موقع ہے کہ وہ اعلیٰ و ادنیٰ کی اس تفریق کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے مقابل اسلام کے اصولِ اخوت و مساوات کو نمایاں کریں۔ اس طرح انہیں نچلی ذاتوں میں تبلیغ کرنے کا بڑا اچھا موقع میسر آ جائے گا۔ اس ضمن میں مَیں نے عرض کیا کہ اسلام کا تبلیغی مزاج ہرگز یہ نہیں ہے کہ گرے پڑے

طبقوں کو ٹارگٹ بنایا جائے۔ ایسا انداز اُن مذاہب کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی دلیل نہ ہو۔ اسی سبب سے عیسائیت کا طریقہ کار یہ ہے کہ گرے پڑے پسماندہ طبقات میں بسکٹوں اور گھی کے ڈبے وغیرہ تقسیم کر دیے جائیں اور ان کی بچیوں کی تعلیم کا کچھ بندوبست کر دیا جائے تاکہ وہ نرسیں بن جائیں۔ اسی طرح اُن کے نام بدل دیے جائیں۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا تبلیغ کر سکتے ہیں؟ اس کے برعکس اسلام کا کبھی بھی یہ معاملہ نہیں رہا۔ اسلام تو دلیل کے ساتھ اوراونچے طبقے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ﴾ (یوسف: ۱۰۸) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے یہ ہے میرا راستہ' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہے''۔ میں جو بات کہہ رہا ہوں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں اور دلیل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اسلام کا چیلنج تو یہ ہے: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (البقرۃ) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ لے آؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو۔'' اگر تمہارے پاس کوئی دلیل موجود ہے تو پیش کرو۔ مشنری طرز کا اندازِ تبلیغ درحقیقت اسلام کا نہیں' عیسائیت کا تصور ہے۔ البتہ اس اعتبار سے ہندوستان میں اگر مسلمان بادشاہوں نے اپنے دَورِ حکومت میں نچلے طبقات کی کسی درجے میں حوصلہ افزائی کی ہوتی تو اُن کی اکثریت مسلمان ہو جاتی۔ بہرحال اب وہ حالات نہیں رہے۔ لہٰذا اب اگر آپ کو ازسرِ نو تبلیغ کرنی ہے تو دلیل کی طاقت سے کیجیے اوراونچے طبقے سے بات کیجیے۔

یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مصر بھیجا تو گلی گلی تبلیغ کے لیے نہیں' بلکہ حکم ہوا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ (النّٰزعٰت) ''(اے موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ' اُس نے سرکشی اختیار کی ہے''۔ اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو وہاں جا کر گلیوں میں تبلیغ کرنے کی بجائے آپؐ نے وہاں کے تین بڑے سرداروں سے ملاقات کی۔ جہاں تک مکہ کا معاملہ تھا اگرچہ وہاں آپؐ نے ہر سطح پر تبلیغ کی ہے' لیکن سب سے پہلے بنو ہاشم کے چوٹی کے

سرداروں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ آپ ﷺ جہاں بھی پہلی مرتبہ تشریف لے گئے وہاں عوام کے بجائے خواص سے بات کی ہے۔ اسی بات کے پیش نظر مَیں نے اپنے گزشتہ دورۂ بھارت میں مولانا علی میاں کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی تھی کہ آپ اپنے دارالعلوم میں سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام بھی کیجیے' تاکہ آپ ایسے علماء تیار کرسکیں جو ہندو مذہب' ہندو ذہن اور ہندو فکر و فلسفہ کو اس کے براہِ راست مآخذ (direct sources) سے سمجھ سکیں۔ اس لیے کہ جب تک آپ ہندو ذہن کو نہیں سمجھیں گے اُسے اپیل کیسے کریں گے! یہی بات اس مرتبہ میں جماعت اسلامی ہند کے اکابرین کے بھی گوش گزار کر کے آیا ہوں کہ اگرچہ آپ بھارت میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم' رسائل و جرائد کے اجراء اور دیگر دینی لٹریچر کی اشاعت کے ذریعے یقیناً ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں' لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ ہندو ذہن بنیادی طور پر منطقی اور فلسفیانہ ہے۔ لہٰذا اُسے approach بھی اُسی راستے سے کیجیے۔ تبھی اونچے طبقے کا ہندو آپ کی بات سنے گا۔ لیکن اگر آپ نچلے طبقے کو ہی ہدف بنائیں گے تو تامل ناڈو جیسے واقعات ہوتے رہیں گے' جہاں نچلے طبقے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا' جس کا ردّعمل یہ ہوا کہ ہندوؤں نے جوابی تحریک کے ذریعے راجستھان میں بے شمار مسلمانوں کو شودر بنا دیا اور یوں لینے کے دینے پڑ گئے۔ کیونکہ مسلمانوں میں بھی تو ایسے بے شمار طبقات موجود ہیں جنہیں دین کی کوئی شُد بُد نہیں۔ اندریں حالات میں نے اُن سے گزارش کی کہ نچلے طبقات کو ہدف بنانے کی بجائے اونچے طبقات کے ہندوؤں کے سامنے اپنی دعوت رکھیں اور اس حوالے سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یہ پیشین گوئی آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ ''ایک وقت آئے گا جب ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔'' لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہو گا جب ''کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ'' کے مصداق اُن سے اُن کی ذہنی سطح کے مطابق یعنی فلسفیانہ انداز میں اور حکمت کے ساتھ بات کی جائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ ؕ﴾(النحل:۱۲۵)

''آپؐ بلایئے لوگوں کو اپنے ربّ کے راستے کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سنا کر' اور بحث ومناظرہ کیجیے اُن سے بہترین انداز سے''۔

اہلِ پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ

بہرحال یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں نے ڈرتے ڈرتے اور ایک عرصے کی ہچکچاہٹ کے بعد بھارتی مسلمانوں کے سامنے رکھی ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر میری زبان ہی نہیں کھلتی رہی۔ اس لیے کہ اُن کو کوئی مشورہ دینے سے پہلے ہمیں اپنا دامن دیکھنا چاہیے کہ ہم نے پاکستان میں کیا کیا۔ وہی مغرب کا جمہوری نظام' وہی سود پرمبنی بینکنگ' وہیں جوا اور سٹہ اور وہی جاگیرداری ہم سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اہلِ بھارت نے کم ازکم جاگیرداری کا جنازہ تو آزادی کے فوراً بعد نکال دیا تھا' لیکن ہمارے ہاں تو یہ سب سے بڑا عفریت آج بھی دندنا رہا ہے اور آج بھی جاگیرداری اسی طرح قائم ودائم ہے۔ تو اس معاملے میں بھی وہ ہم سے آگے نکلے ہیں۔ چنانچہ بھارت کا مسلمان بھی ہم سے بازی لے گیا ہے اور وہاں کا ہندو بھی۔ البتہ سرمایہ داری کی لعنت وہاں بھی ہے' یہاں بھی ہے۔ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے اور حکومتی سطح پر جو اقدامات ہو رہے ہیں اور اسمبلیوں میں جو کارروائیاں ہورہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ہرکوئی ایک دوسرے پر الزام تراشی کررہا ہے۔ وہ خود اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سب لٹیرے ہیں۔ بس اس سے آگے اور کوئی دلیل نہیں کہ ''ہم نے لوٹا تو تم نے بھی تو لوٹا!'' گویا اِس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کا کیا نتیجہ نکلے گا: ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

اس تشویش ناک صورتِ حال کے پیشِ نظر میری آپ سے گزارش ہے کہ خوابِ

غفلت سے بیدار ہوں‘ سوئے نہ رہیں۔ ع ’’دوڑ و زمانہ چال قیامت کی چل گیا!‘‘ اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ نظام کو بدلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ڈھائی سو برس پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یہ الفاظ کیسے کہہ گئے کہ ’’فَکُّ کُلِّ نِظَامٍ‘‘۔ دراصل یہ وہ نابغہ شخصیات ہوتی ہیں جو علمی اور فکری میدان میں قوم کی راہنمائی کرتی ہیں۔ جیسے میں علامہ اقبال کا حوالہ دیتا ہوں‘ اسی طرح علامہ اقبال سے پہلے اس برعظیم پاک و ہند میں علمی وفکری میدان میں نہایت جامع اور پورا شعور رکھنے والی شخصیت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہے۔ علامہ اقبال نے موجودہ دَور میں مغرب کے فکر اور فلسفے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں‘ جبکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے دَور میں اسلام کی ایک مستحکم اور مثبت تعبیر کر گئے‘ کیونکہ اُس دَور میں ابھی مغربی فکر و فلسفہ تو آیا ہی نہیں تھا۔ اسی اعتبار سے فَکُّ کُلِّ نِظَامٍ کا حوالہ میں نے آپ کے سامنے رکھا۔ باطل نظام کے تار و پود بکھیرے بغیر تو حق کا نظام قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔

نظامِ خلافت کے خدوخال

اس ضمن میں جس تحریک خلافت کا ہم نے آغاز کیا ہے‘ اگرچہ ابھی تک کوئی major break through تو نہیں ہوا‘ لیکن ایک چہ میگوئی ضرور شروع ہوگئی ہے‘ ہلچل سی ہے کہ یہ خلافت کی بات کدھر سے آ گئی‘ اس کا مطلب کیا ہے؟ وغیرہ۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ آغاز میں کچھ مغالطے ہوتے ہیں۔ چنانچہ مغالطہ یہ ہو رہا ہے کہ نظامِ خلافت کے قیام سے شاید ہماری مراد مُلّاؤں کی حکومت (theocracy) کا قیام ہے۔ دراصل ایک چیز ذہنوں سے محو ہو چکی تھی‘ لہٰذا اس کا نام اب لوگوں کے لیے غیر مانوس سا ہے۔ اسی طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہمیں اُس وقت بھی کرنا پڑا تھا جب ہماری طرف سے بیعت کا لفظ سامنے آیا تھا‘ گویا ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں جو بھی اندیشے یا مغالطے تھے وہ دُور ہو گئے۔ اسی طرح خلافت کا لفظ آیا ہے تو اس پر بھی لوگ چونکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مسلسل محنت اور جدوجہد سے اس ضمن میں پائے جانے والے مغالطوں اور شکوک وشبہات کو دُور کرنا ہے۔

اس ضمن میں چند باتیں مَیں دانشور حضرات کو نوٹ کرانا چاہتا ہوں۔ اوّلاً یہ کہ جہاں تک لفظ خلافت کا تعلق ہے یہ صرف حاکمیت (sovereignty) کے مقابلے میں ہے۔ اسلام میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے' انسان کے لیے نہیں۔ انسان کے لیے خلافت ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت کا اصول عوامی حاکمیت ہے۔ اسلام میں حاکمیت کا لفظ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال کرنا کفر ہے۔ اسی بات کے پیش نظر جمہوریت کے ساتھ ''اسلامی'' کا لفظ لگایا جاتا تھا اور ''اسلامی جمہوریت'' کا مطلب اللہ کی حاکمیت کے تحت جمہوری اور شورائی نظام لیا جاتا تھا۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب ہمارے دین میں اس کے لیے صحیح (proper) اصطلاح موجود ہے تو کیوں نہ اسے اختیار کیا جائے۔ ثانیاً اس سے ہماری مراد وہ مکمل سیاسی' معاشی اور سماجی نظام ہے جس کا مظہرِ کامل واَتم خلافت راشدہ تھی۔ اسی لیے ہم نے دس نکات معین کیے ہیں جو سیاسی' معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

اس ضمن میں تیسری اہم بات جو مَیں نوٹ کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ تو اب جوں کی توں قائم ہو نہیں سکتی۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ لوگوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔ گویا وہ دورِ نبوت کا ایک ضمیمہ تھی۔ اُس وقت دلیل یہ نہ تھی کہ ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے' بلکہ دلیل یہ تھی کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا قریبی ساتھی کون ہے! ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾. جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا تو یہ نہیں کہا کہ بڑے سمجھ دار ہیں' بڑے فہیم اور زیرک ہیں۔ بلکہ یہ کہا: ''یہ عمرؓ موجود ہیں' اللہ کے رسول ﷺ دنیا سے اِس حال میں تشریف لے گئے تھے کہ اِن (عمرؓ) سے راضی تھے' لہٰذا ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو''۔ موجودہ دَور میں یہ دلیل اب کسی کے لیے نہیں۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی ایک درجہ بندی تھی۔ یعنی پہلے عشرۂ مبشرہ' پھر اصحابِ بدر' پھر اصحابِ بیعت رضوان۔ اس درجہ بندی کا بھی اب کوئی سوال نہیں۔ اسی طرح اُس دَور میں قبائلی نظام تھا جو اَب موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے خلافت راشدہ

کانقشِ ثانی (replica) تو ممکن ہی نہیں۔ عصرِ حاضر میں خلافت کا جو نظام بنے گا اُس میں دورِ خلافت راشدہ سے راہنما اصول لے کر اُن کے ساتھ دَورِ جدید کے تقاضوں اور عمرانی ارتقاء (social evolution) کو سمویا جائے گا۔ علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا تھا کہ اسلام کا نظامِ حکومت republican نوعیت کا ہے۔ republican طرزِ حکومت تو دنیا کو آج نظر آیا ہے' جبکہ اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کی جھلک تو دنیا دورِ خلافتِ راشدہ میں دیکھ چکی ہے۔ آج ہمیں نظام خلافت کو دَورِ حاضر کے اعلیٰ ترین تقاضوں کے مطابق develop کرنا ہوگا۔

اس نظام کے نمایاں ترین خصائص انسانی حاکمیت کی نفی' کتاب و سنت کی بلا استثناء مکمل بالا دستی اور کفالتِ عامہ کے نظام کے تحت عوام کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہیں۔ علاوہ ازیں دستور سازی کے عمل میں صرف مسلمان حصہ لے سکیں گے اور خلیفہ صرف مسلمان مَرد ہوگا۔ یہ ہیں نظامِ خلافت کے بنیادی خدوخال۔ اِس نظام کے قیام کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشش اور جدوجہد ہمارا فرض ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت بھی اِن شاء اللہ ہمارے شاملِ حال ہوگی۔

اختتامِ گفتگو سے پہلے میں آپ کو پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آج معاملہ صرف پاکستان کا نہیں' بلکہ کم ازکم پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے فرضِ کفایہ کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے۔ اگر ہم اس فرض کی ادائیگی میں مزید کوتاہی کے مرتکب ہوئے تو پھر اللہ کے بھی مجرم ٹھہریں گے اور ان کے بھی جنہوں نے ہمیں پاکستان بنوا کر دے دیا تھا۔ چنانچہ اب کمر ہمت کسنے کی ضرورت ہے۔ اس تحریک سے تعاون کے لیے آگے بڑھیے۔ نظامِ خلافت کے قیام سے ہم اسلام کے اصل نظام کا وہ نمونہ دنیا کو دکھا سکیں گے جس کا خواب کبھی علامہ اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی توبہ کرنے کی بھی فوری توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے بھی اپنا تن' من' دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

1

دعوت دین

حدود آرڈی نینس پر اعتراضات کا جائزہ

انجینئر نوید احمد ☆

۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ بمطابق ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں حدود آرڈی نینس کا نفاذ ہوا۔ یہ آرڈی نینس پانچ اجزاء پر مشتمل تھا :

۱) جرمِ زنا (نفاذِ حدود) آرڈی نینس

۲) جرمِ قذف (نفاذِ حد) آرڈی نینس

۳) جائیداد سے متعلق جرائم (نفاذِ حدود) آرڈی نینس

۴) حکمِ امتناع (نفاذِ حد) آرڈی نینس

۵) اجرائے سزائے تازیانہ آرڈی نینس

سیکولر سوچ رکھنے والے دانشور اس آرڈی نینس کے زنا سے متعلق جزو پر وقتاً فوقتاً اعتراض کرتے ہی رہے ہیں‘ لیکن پچھلے چند ہفتوں سے اِس حوالے سے تبصروں میں کچھ زیادہ ہی تیزی اور شدت آ گئی ہے۔ ایک نجی ٹی وی چینل اور ایک قومی روزنامہ نے اس مسئلہ پر بحث ومباحثہ کا آغاز کیا اور اب اس بحث کی غیر معمولی تشہیر کی جارہی ہے۔ مناسب ہوگا کہ ذرا گہرائی میں اتر کر حدود‘ حدود آرڈی نینس اور اس آرڈی نینس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے۔

قرآنِ حکیم میں حدود کا ذکر

قرآنِ حکیم میں ’’حدود اللہ‘‘ سے مراد ہیں احکاماتِ شریعت۔ قرآن حکیم میں ’’حدود‘‘ کی اصطلاح چودہ مرتبہ آئی ہے‘ جن میں سے نو مرتبہ یہ اصطلاح احکاماتِ شریعت کے حوالے سے آئی ہے :

۱) سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۸۷ میں اعتکاف کے دوران بیویوں سے مباشرت کی ممانعت کا حکم

☆ ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

دینے کے بعد فرمایا :

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾

''یہ اللہ کی حدود ہیں پس اِن کے قریب بھی مت جاؤ''۔

۲) سورۃ البقرۃ میں پانچ بار حدود کی اصطلاح نکاح اور طلاق کے مسائل کے بیان کے دوران آئی ہے۔

۳) سورۃ النساء میں یہ اصطلاح وراثت کے احکامات کے بعد آئی ہے۔

۴) سورۃ المجادلۃ میں ظہار (شوہر کا قسم کھانا کہ اس کی بیوی ماں یا کسی محرم خاتون کی طرح اُس کے لیے حرام ہوگئی ہے) کے کفارہ کے بیان کے بعد یہ اصطلاح آئی ہے۔

۵) سورۃ الطلاق میں طلاق سے متعلق ہدایات دینے کے بعد اس اصطلاح کا استعمال ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں چار بار یہ اصطلاح اللہ کے احکامات کے علم سے غفلت یا روگردانی کی مذمت کے حوالے سے آئی ہے :

۱) سورۃ التوبہ میں فرمایا :

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۹۷﴾﴾

''دیہاتی لوگ سخت ہیں کفر اور نفاق کے اعتبار سے اور اِسی قابل ہیں کہ ناواقف رہیں اُن احکامِ (شریعت) سے جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

اس آیت میں گویا دیہاتیوں کو ملامت کی گئی کہ وہ حدود اللہ کا علم حاصل کرنے کے لیے مدینہ آ کر نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے فیض حاصل کیوں نہیں کرتے۔

۲) سورۃ النساء میں وعید سنائی گئی :

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۴﴾﴾

''اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی طے کردہ حدود کو پامال کرے گا اللہ اُسے دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا' اور اُس کے لیے ذلت کا عذاب ہوگا''۔

۳) سورۃ البقرۃ میں خبردار کیا گیا :

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

''اور جو کوئی اللہ کی طے کردہ حدود کو پامال کرتا ہے پس ایسے ہی لوگ ظالم ہیں''۔

۴) سورۃ الطلاق' آیت ا میں آگاہ کیا گیا :

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط﴾

''اور جو کوئی اللہ کی طے کردہ حدود کو پامال کرے پس اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا''۔

قرآن حکیم میں ایک بار اللہ کے محبوب بندوں کی چوٹی کی صفت بتائی گئی کہ وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ (التوبة)

''توبہ کرنے والے' (اللہ کی) بندگی کرنے والے' (اللہ کی) حمد کرنے والے' لذّاتِ دُنیوی سے کنارہ کرنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیک کاموں کا حکم کرنے والے اور بُری باتوں سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ (یہی مؤمن لوگ ہیں' اور اے نبیؐ!) بشارت دیجیے اِن مؤمنوں کو''۔

احادیثِ مبارکہ اور فقہ میں حدود کی اصطلاح

احادیثِ مبارکہ میں اور فقہی اعتبار سے حدود کی اصطلاح بعض جرائم کی انتہائی سزاؤں کے حوالے سے آئی ہے۔ اسلامی شریعت کی رُو سے سزائیں تین قسم کی ہیں: حدود' قصاص اور تعزیرات۔

۱) **حدود** : یہ وہ سزائیں ہیں جو بطورِ حق اللہ متعین کی گئی ہیں۔ چھ جرائم ایسے ہیں جن کی سزائیں حدود کے تحت آتی ہیں :

(ا) ڈاکہ' رہزنی اور بغاوت' جس کی سزا ہے بدترین قتل' یا مخالف سمتوں سے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دینا' یا جلاوطن کرنا' یا سولی چڑھانا۔

(ب) چوری' جس کی سزا ہے ہاتھ کاٹنا۔

(ج) زنا' جس کی سزا غیر شادی شدہ مجرم کے لیے ہے سو (۱۰۰) کوڑے جو کہ قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ بعض روایات کے مطابق ایک سال کی جلاوطنی بھی اس میں شامل ہے۔

اور شادی شدہ مجرم کے لیے ہے سنگسار کرنا۔

(د) تہمتِ زنا، جس کی سزا ہے اسّی (۸۰) کوڑے مارنا۔

(ہ) شراب نوشی اور منشیات کا استعمال، جس کی سزا ہے اسّی (۸۰) کوڑے مارنا۔

(و) ارتداد یعنی دین اسلام سے پھر جانا، جس کی سزا ہے قتل کرنا۔

حدود کے نفاذ کے لیے شریعت میں گواہی اور کچھ دیگر شرائط بھی طے کی گئی ہیں، جن کی تفاصیل فقہ کی کتب میں بیان کی گئی ہیں۔ حدود کے ضمن میں متعین سزائیں زمان و مکان بدلنے سے تبدیل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح حدود کے معاملہ میں جرم ثابت ہونے پر کسی حاکم یا قاضی کو سزا معاف کرنے اور کمی یا بیشی کرنے کا اختیار نہیں۔ اس معاملہ میں سفارش کرنا یا سفارش قبول کرنا بھی حرام ہے۔ توبہ کرنے سے دنیا کی سزا معاف نہیں ہوتی، البتہ آخرت میں معافی مل سکتی ہے۔ البتہ ڈاکہ، رہزنی اور بغاوت کا ارتکاب کرنے والے مجرم اگر گرفتاری سے پہلے خود کو حکومت کے حوالے کر دیں تو اُنہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔

۲) **قصاص**: یہ وہ سزائیں ہیں جو بطور حقُ العبد متعین کی گئی ہیں۔ یہ سزا قتلِ عمد یا کسی کو مجروح کرنے کے جرم میں دی جاتی ہے اور مجرم کے ساتھ وہی کچھ کیا جاتا ہے جو اُس نے متأثرہ شخص کے ساتھ کیا ہو۔ یہ سزا متأثرہ فریق خون بہا لے کر یا بغیر کچھ لیے معاف کرسکتا ہے۔

۳) **تعزیرات**: جن جرائم کی سزائیں اللہ یا اس کے رسول ﷺ نے معین نہیں فرمائیں اور اُنہیں حاکم یا قاضی کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے، اُنہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ یہ سزائیں قید، جرمانہ یا کوڑوں کی صورت میں دی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی شخص پر حدود کے نفاذ کی شرائط پوری نہ ہو رہی ہوں یا قصاص کی صورت میں اُسے متأثرہ فریق نے معاف کر دیا ہو، لیکن واضح شواہد سے محسوس ہو کہ جرم سرزد ہوا ہے تو معاشرہ میں مجرموں کی حوصلہ شکنی اور دوسروں کی مال، جان اور آبرو کی حفاظت کے لیے قاضی قید، جرمانہ یا کوڑوں کی سزا دے سکتا ہے۔

معاشرہ میں فتنہ وفساد اور اس کا سدّ باب

دنیا میں اکثر و بیشتر فتنہ وفساد زَن، زر اور زمین کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ نظام سب سے زیادہ عادلانہ ہے جو اِس حوالے سے زیادتی کی روک تھام کر سکے۔ قیامِ عدل دینِ اسلام کی امتیازی شان ہے۔ اسلام نے معاشرہ میں فساد کو روکنے کے لیے ایسے قوانین وضوابط عطا فرمائے ہیں جو انسانی جان کے احترام، عورت کے ناموس کی حفاظت اور لوگوں کے مال و جائیداد کے تحفظ کے لیے انتہائی مفید اور امن و امان کے ضامن ہیں۔ پھر خاص طور پر

3

عورت، خاندان اور معاشرے کے تحفظ کے لیے زنا جیسے جرم کے سدّ باب کی خصوصی اہمیت ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾﴾ (بنی اسراء یل)

'' اورزنا کے پاس بھی نہ جاؤ' بے شک وہ بے حیائی ہےاور بُرا راستہ ہے''۔

اس آیت میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ '' زنا نہ کرو' بلکہ فرمایا گیا '' زنا کے قریب بھی مت جاؤ''۔گویا ان تمام راستوں کو بند کرنے کا حکم ہے جو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر اِس آیت میں زنا کو''سَآءَ سَبِيْلًا'' یعنی برا راستہ قرار دیا گیا ہے' کیونکہ یہ خاندان کے ادارے کو دو طرح سے تباہ کرتا ہے۔اوّل یہ کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اعتماد اور محبت کا رشتہ ختم ہو جاتا ہےاور گھر میں سکون کی فضا باقی نہیں رہتی' جس سے اولاد پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔اسلام گھر میں ایسی فضا قائم کرنا چاہتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے لیے تمام جنسی کشش صرف ایک دوسرے میں ہو' تا کہ خاندان کا ادارہ مستحکم ہو۔دوم یہ کہ والد کو اپنی اولاد کے حوالے سے شک ہو جاتا ہے' لہٰذا وہ اولاد کی پرورش اور تربیت پر مناسب توجہ نہیں دیتا۔اولاد اِس رویہ کو محسوس کرتی ہے اور پھر ردِّ عمل کے طور پر بڑھاپے میں والدین کی خدمت نہیں کرتی۔ان وجوہات کی بنا پر خاندان کا ادارہ تباہ ہو جاتا ہےاور اس کے مضر اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔

پاکستان میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق صاحب جب ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے ملک میں عادلانہ معاشرے کے قیام کے لیے نفاذِ حدود کی طرف بھی توجہ دی۔ ضیاء الحق مرحوم ایک طرف ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی بھی خواہش رکھتے تھے لیکن دوسری طرف اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے وہ اُن ساتھی جرنیلوں کو بھی راضی رکھنے پر مجبور تھے جن کی سوچ اسلامی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نفاذِ اسلام کے حوالے سے ان کے اکثر اقدامات نیم دلانہ ثابت ہوئے۔ بہرحال پینٹاگون میں مذاکرات سے قبل نمازِ عصر کی ادائیگی اور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر سے قبل تلاوتِ کلامِ پاک کی ریکارڈنگ لگانے پر اصرار اس بات کے ثبوت ہیں کہ وہ اسلامی اقدار کے حوالے سے کسی مرعوبیت کا شکار نہیں تھے۔

ملک میں نفاذِ حدود کے لیے موصوف نے دس انتہائی موزوں افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی اور اُسے ایک حدود آرڈی نینس مرتب کرنے کا کام سونپا۔ اس کمیٹی کے ممبران

میں چوٹی کے علماء‘ ماہرینِ قانون اور ریٹائرڈ جج صاحبان شامل تھے۔ علماء کرام میں مولانا ظفر احمد انصاریؒ ‘ مولانا محمد تقی عثمانی‘ پیر کرم شاہ الازہریؒ اور ایک نامور دینی اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی شامل تھے۔ ماہرین قانون میں سے اے کے بروہی‘ خالد اسحاق اور شریف الدین پیرزادہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ریٹائرڈ جج صاحبان میں سے اے کے صمدانی‘ محمد افضل چیمہ اور صلاح الدین کو کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ کمیٹی نے حدود آرڈی نینس کی تیاری کے لیے جس طرح تفصیل اور گہرائی کے ساتھ غور وفکر کیا‘ اس کی مثالیں پاکستان میں کم ملتی ہیں۔ کمیٹی نے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک نامورترین اہل علم سے تبادلۂ خیال کر کے آرڈی نینس مرتب کیا۔ آرڈی نینس مرتب کرنے کے بعد اس کا ابتدائی مسودہ مختلف وزارتوں‘ شعبہ ہائے حکومت اور عوامی رائے کے حصول کے لیے مشتہر کیا گیا۔ تقریباً چودہ ماہ کے طویل غور وفکر اور مشاورت کے بعد اُس وقت کی وفاقی کابینہ کی منظوری سے یہ آرڈی نینس نافذ کر دیا گیا۔

[فاضل مضمون نگار نے یہاں ’’جرمِ زنا (نفاذِ حدود) آرڈی نینس‘‘ کا مکمل متن بھی نقل کیا تھا‘ جسے مضمون کی طوالت کے خوف سے حذف کر دیا گیا ہے۔ ادارۂ میثاق]

حدود آرڈی نینس کی منظوری

عام طور پر یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ حدود آرڈی نینس کو فردِ واحد نے نافذ کر دیا۔ یہ تأثر درست نہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۸۵ء میں وجود میں آنے والی قومی اسمبلی نے اسے منظور کر کے باقاعدہ دستوری تحفظ دیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء‘ ۱۹۹۰ء‘ ۱۹۹۳‘ ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں قائم ہونے والی اسمبلیوں نے بھی اس آرڈی نینس کو برقرار رکھا اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

حدود آرڈی نینس کے بارے میں موجودہ بحث ومباحثہ

اس سال ماہِ جون میں اچانک ایک نجی ٹی وی چینل نے حدود آرڈی نینس پر گفتگو کا آغاز کیا اور اب مسلسل کئی ہفتوں سے اسے بحث کا موضوع بنایا ہوا ہے۔ اخبارات میں جہازی سائز کے اشتہارات دیے جا رہے ہیں۔ علماء اور دانشوروں کے درمیان مکالمات‘ سادہ لوح علماء کے بیانات اور بعض جید علماء کے سیاق وسباق سے علیحدہ بیانات کو شائع کر کے آرڈی نینس پر اعتراضات وارد کیے جا رہے ہیں اور اس آرڈی نینس میں ترمیم کی ایک مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس مہم میں آرڈی نینس کی مخالفت واضح طور پر غالب محسوس ہوتی ہے۔ ایسا تأثر پیش کیا جا رہا ہے جیسے اِس وقت مسلمانانِ پاکستان کو صرف ایک ہی مسئلہ درپیش ہے اور وہ ہے حدود آرڈی نینس۔ اس آرڈی نینس کے حوالے سے جو اشتہاری مہم شروع کی گئی

ہے اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کے ایمان ویقین کی بقاء اس مسئلہ کے حل ہی میں مضمر ہے۔ جس فراخ دلی سے اس مہم میں کروڑوں روپے اور دوسرے مادی وسائل جھونک دیے گئے ہیں اور جس قماش کے دانشوروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اس سے اسلام اور احکاماتِ شریعت کے خلاف گہری سازش کی بو آتی ہے۔ یہ زبردست مہم صاف چغلی کھا رہی ہے کہ یہ بش اینڈ کمپنی کے شروع کردہ کروسیڈ کا علمی، قلمی اور نشریاتی محاذ ہے جس نے اسلام کے شرعی احکامات کو اپنا ہدف بنالیا ہے اور اُن پر حملہ کر رہا ہے۔ گویا:

اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی
اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات اُن کی

نتیجتاً حکومت کی طرف سے حدود آرڈی نینس کو منسوخ کرنے کے بیانات بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔

حدود آرڈی نینس پر اعتراضات

روزنامہ جنگ کراچی کی ۱۴ جون ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں حدود آرڈی نینس پر گیارہ اعتراضات شائع کیے گئے ہیں۔ ذیل میں ان اعتراضات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ چار اعتراضات کا تعلق آرڈی نینس میں کسی نقص سے نہیں بلکہ عمل درآمد کی خرابی سے ہے:

۱) کسی کو بدنام کرنے کے لیے اس آرڈی نینس کے تحت جھوٹے مقدمہ کا اندراج کرایا جاتا ہے اور پولیس الزام ثابت ہونے سے پہلے ہی ملزم یا ملزمہ کو قید کر لیتی ہے۔

۲) مقدمہ سچا ہو یا جھوٹا، فیصلہ ہونے تک خواتین کو قید رکھا جاتا ہے جس سے اُن کی نیک نامی پر حرف آتا ہے اور معاشرہ انہیں قبول نہیں کرتا۔

۳) ایک خاتون کا حاملہ ہونا اُس کے مجرم ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، جب تک وہ ثابت نہ کرے کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر ہوا ہے۔

۴) عصمت دری کی شکایت دائر کرنے والی خاتون کے بیان کو اعترافِ گناہ قرار دے کر موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا چار اعتراضات میں بیان شدہ مظالم دراصل نتیجہ ہیں ہمارے ضابطۂ فوجداری کی پیچیدگیوں اور تفتیشی ایجنسیوں کی ناقص کارکردگی اور بددیانتی کا۔ پاکستان میں ہر قانون کے مقاصد عمل درآمد کرنے والے اہلکاروں کے طرزِ عمل کی وجہ سے پورے نہیں ہوتے۔ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ قانون بنتا ہی اسی لیے ہے تاکہ سرکاری اہلکاروں اور پولیس کو

رشوت ستانی اور بھتہ خوری کے نئے مواقع حاصل ہو جائیں۔ اس مسئلہ کا یہ حل نہیں کہ قانون ہی ختم کر دیں‘ بلکہ خرابی پیدا کرنے والے عناصر کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ حدود آرڈی نینس کے حوالے سے مندرجہ بالا تمام زیادتیوں کی وجہ ملک میں رائج جاگیرداری کلچر‘ پولیس کے نظام کی خرابیاں اور غیر اسلامی معاشرتی برائیاں ہیں۔ لہٰذا توجہ اِن مسائل کی اصلاح کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ حدود آرڈی نینس کی مخالفت اور اس میں ترامیم پر۔

پانچواں اعتراض: الزام ثابت نہ کرنے والوں کے خلاف قذف کی حد نافذ نہیں کی جاتی اور اس کے لیے موردِ الزام ٹھہرنے والے کو علیحدہ سے درخواست دائر کرنی پڑتی ہے۔

الزام لگانے والے کے خلاف قذف کی حد جاری کرنے کے لیے علیحدہ سے درخواست دینے کا ضابطہ ایک خاص سبب سے بنایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ الزام سچا ہو لیکن الزام لگانے والا مطلوبہ شہادتیں فراہم نہ کر سکے۔ ایسے میں مجرم تو سزا سے بچ جائے گا اور وہ یہ جانتے ہوئے کہ الزام لگانے والا سچا ہے‘ اُس کے خلاف قذف کی حد جاری کرنے کی درخواست دائر نہیں کرے گا۔ دوسری صورت میں الزام لگانے والا الزام ثابت نہ کرنے پر قذف کا مجرم ٹھہرے گا۔

چھٹا اعتراض: حدود آرڈی نینس کا اطلاق غیر مسلموں پر بھی کر دیا گیا ہے‘ جبکہ اسلامی ریاست میں شریعت کا تقاضا ہے کہ غیر مسلم اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں اور اُن پر مقدمات بھی ان کی مذہبی تعلیم کے مطابق چلنے چاہئیں۔

شخصی قوانین میں تو ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے فرد کو یہ مکمل آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کروائے‘ جیسے نکاح وطلاق اور وراثت سے متعلق مسائل میں ہر مذہب کے لوگ اپنے قوانین کے مطابق فیصلہ کروا سکتے ہیں۔ البتہ وہ ملکی قوانین جن کا تعلق امن و امان اور معاشرے میں جرائم کی بیخ کنی سے ہوتا ہے‘ ان کا اطلاق بلاتفریق تمام شہریوں پر کیا جاتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ پوری دنیا میں یہی اُصول رائج ہے۔ مثلاً امریکہ میں اگر ایک مسلمان عورت ظلم کا شکار ہوتی ہے تو وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ ظالم کو اسلامی قانون کے مطابق سزا دی جائے‘ بلکہ وہاں کے ملکی قانون کا اطلاق ہو گا۔ اسلامی سزاؤں کا مقصد ہی جرائم کا سدّ باب اور اُن کی بیخ کنی ہے۔ اگر یہ اُصول اپنا لیا جائے کہ مسلمان کو تو زنا کے جرم میں کوڑے مارے جائیں گے اور غیر مسلموں کو اس حد سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے گا تو اس سے جرم کے ارتکاب کا دروازہ کھل جائے گا اور معاشرے

میں ان جرائم کی شرح بڑھ جائے گی۔فرض کیجیے کہ ایک غیر مسلم‘ مسلمان عورت کے ساتھ زنا کے جرم کا ارتکاب کرے‘ اب مسلمان عورت پر تو حد جاری کی جائے اور غیر مسلم کو ہلکی سزا دی جائے‘ تو یہ نا انصافی ہے۔ امام مالکؒ کے سوا تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ حدود کا تعلق ملکی قوانین(law of the land) سے ہے اور ان کا اطلاق ملک میں بسنے والے تمام شہریوں پر ہوگا۔

ساتواں اعتراض : گواہوں کے معیار کا تعین کرتے ہوئے حدود آرڈی نینس میں مذہب اور جنس کی بنیاد پر تمیز کی گئی ہے اور یہ شریعت کے منافی ہے۔

سورۃ النساء میں جب بدکاری کرنے والی خواتین کے خلاف سزا کا ابتدائی حکم آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾﴾

’’اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں اُن پر اپنے لوگوں میں سے چار آدمیوں کو گواہ بناؤ۔ پھر اگر وہ (اُن کی بدکاری کی) گواہی دیں تو اُن عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت اُن کا کام تمام کردے یا اللہ اُن کے لیے کوئی اور سبیل پیدا کردے‘‘۔

اس آیت میں ’’مِنْکُمْ‘‘ کا لفظ ثابت کر رہا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے کہ گواہ مسلمانوں میں سے ہونے چاہئیں۔گواہوں کے مسلمان ہونے کی شرط چند دیگر مسائل میں بھی عائد کی گئی ہے‘ مثلاً ادھار لین دین کے معاملہ میں (البقرۃ:۲۸۲)‘ وصیت کی گواہی میں (المائدۃ:۱۰۶) اور ایک یا دو طلاقوں کے بعد عدت پوری ہونے پر بیوی کو رخصت کرنے یا اُس سے پھر سے تعلق قائم کرنے کی صورت میں (الطلاق:۲)۔

گواہی دینا کوئی اعزاز نہیں‘ بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔آرڈی نینس میں عورت کو گواہی کی ذمہ داری سے الگ رکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک رعایت ہے جو خواتین کو دی گئی ہے۔ زنا بالرضا کے مقدمات میں گواہی کے مخصوص الفاظ نیز مخالف وکلاء کی مخصوص جرح خواتین کے لیے سخت ذہنی کوفت کا باعث بن سکتے ہیں۔اسی لیے احترامِ نسوانیت کے سبب ایسے مقدمات میں خواتین کو گواہی سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے چار مردوں کی گواہی طلب کی

گئی ہے۔ اگر معاملہ تعزیرات کا ہو یا زنا بالجبر کا ہو تو عورت کی گواہی بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

آٹھواں اعتراض : اگر زنا بالرضا کے لیے شہادتیں ناکافی ہوں تو پھر آرڈی نینس کے ذریعے تعزیرات کا سہارا لیا جاتا ہے جو عدل کے منافی ہے۔

اگر چار سے کم گواہوں کی موجودگی میں یہ ثابت ہو جائے کہ ایک مرد اور ایک عورت آپس میں بے حجاب تھے تو گواہ صرف بے حجابی کی گواہی دیں گے اور ایسے لوگوں کے خلاف تعزیر کے تحت سزا کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے بے حجاب تصاویر پیش کر دے۔ اب ایسے میں مجرم کو بالکل معاف کر دینا معاشرے میں بے حیائی کے فروغ کا باعث ہوگا۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن' جلد سوم میں اس حوالے سے لکھتے ہیں :

''یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جن صورتوں میں حدِ شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرأت پیدا ہو' بلکہ حاکم اس کے مناسبِ حال اس کو تعزیری سزا دے گا' اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں' جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسدادِ جرائم کا مکمل انتظام ہے۔ فرض کیجیے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے اور گواہ عادل وثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہوسکتا' مگر ازروئے قانونِ شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حدِ شرعی جاری نہیں ہوگی' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دے دی جائے' بلکہ حاکمِ وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہوگی' یا چوری کے ثبوت کے لیے جو شرائط مقرر ہیں ان میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے اُس پر حدّ شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہوسکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہو گیا' بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسبِ حال دی جائیں گی۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے۔ یہ بات آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے' بلکہ حاکمِ وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے' اس لیے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاءِ مقتول کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرأت بڑھ جائے گی' اور قتل کی واردات عام ہو جائیں گی' کیوں کہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا' وہ اس نے معاف کر دیا' لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا فرض اور لوگوں کا حق ہے' وہ اس

حق کے تحفظ کے لیے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کر سکتی ہے''۔

نواں اعتراض : حدود آرڈی نینس میں حد کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال نہیں رکھا گیا کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کیا تھے جن میں جرم سرزد ہوا۔ مثلاً قرآن میں لونڈی کی سزا نصف یعنی پچاس (۵۰) کوڑے ہے۔

اسلامی ریاست کا ایک مقصد ہے کہ معاشرے کو پاکیزہ بنایا جائے۔ اس کے لیے ایک طرف ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے معاشرہ میں شرم وحیا کی اقدار کا احیاء کیا جائے اور دوسری طرف سخت قوانین کے ذریعے بے حیائی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ حدود آرڈی نینس کے ذریعے سخت قوانین کا نفاذ تو کر دیا گیا' اب یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ میں ایسی تمام سرگرمیوں پر پابندی ہو جو زنا کا محرک بنتی ہیں' اور معاشرے میں شرم وحیا کی اقدار کے فروغ کے لیے خصوصی اہتمام کیا جائے۔ بدقسمتی سے آج جن ذرائع ابلاغ کے ذریعے حدود آرڈی نینس کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے وہی معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے بجائے بگاڑنے میں پیش پیش ہیں۔ پردے کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا جاتا ہے' اشتہارات' ڈراموں اور فلموں کے ذریعے بے حیائی کی اشاعت کی جا رہی ہے' جنسی اسکینڈلز کو عام کر کے ذہن خراب کیے جا رہے ہیں' محبت کی شادیوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے' عورتوں کو گھروں سے باہر نکلنے اور بے حجاب ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے' فنکاروں اور گلوکاروں کو بڑی اہمیت دے کر اُن کے انٹرویو شائع کیے جا رہے ہیں اور اُنہیں حسن کارکردگی کے ایوارڈ دیے جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جس معاشرے میں فحاشی اور عریانی عروج پر ہو' میڈیا کے زیر اثر نوجوان نسل تیزی سے بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہو تو ان حالات میں حد زنا کی سخت سزاؤں کا نفاذ غیر مناسب ہے۔ لہٰذا جب تک برائی پر آمادہ کرنے والے تمام عناصر کا قلع قمع نہیں کر دیا جاتا اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آ جاتا اُس وقت تک اس قانون کو ختم کر دینا چاہیے۔

دورِ حاضر کے انسانی معاشرے میں مثالی اسلامی معاشرے کا قیام ایک مشکل بات ہے۔ نیز اس بات کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں کہ معاشرہ مثالی بن چکا ہے یا نہیں۔ اسلام نے جس مثالی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے وہ دراصل ایک ہدف ہے جس کے حصول کے لیے

مسلسل جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں جو معاشرے مہذب کہلاتے ہیں وہاں بھی چوری، ڈاکہ، فراڈ اور خواتین کی بے حرمتی جیسے واقعات بڑی تعداد میں وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس لیے یہ اعتراض محض فرار کا ایک راستہ ہے۔ دراصل معاشرے سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے اور اسے مثالی معاشرہ بنانے کے لیے ہی قوانین بنائے اور نافذ کیے جاتے ہیں۔ حدِّ زنا کا قانون بھی معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ موجودہ حالات میں جب کہ بہت سے عناصر افراد کو جرمِ زنا کے ارتکاب پر مجبور کر رہے ہیں، سنگسار کرنے یا کوڑے لگانے جیسی سخت سزاؤں کا قانون نامناسب ہے۔ ہمارے خیال میں مسئلہ کا حل یہ ہرگز نہیں کہ اس قانون کو ہی ختم کر دیا جائے، بلکہ دراصل ان عناصر کا خاتمہ ہونا چاہیے جو معاشرے کو برائی کی آماج گاہ بنا رہے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ حدِّ زنا کا قانون کوئی جامد قانون نہیں۔ دراصل یہ عدالتوں کا کام ہے کہ وہ مقدمہ کی تفصیلات، واقعات کا پس منظر، جرم کے محرکات اور ملزم کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مقدمہ کا فیصلہ کریں اور سزا کا تعین کریں۔ شریعتِ اسلامی میں ذرا سا شائبہ بھی حدِّ زنا کو ساقط کر دیتا ہے۔ شریعت کا مستقل اُصول ہے کہ ''شبہات کی بنا پر حدود ساقط ہو جاتی ہیں''۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۹ء سے لے کر اب تک حدّ کی سزا پاکستان میں نافذ نہیں کی گئی، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان مقدمات میں تمام ملزموں کو بری کر دیا جاتا ہے، بلکہ عدالت کو مقدمہ کے حالات کے مطابق تعزیری سزا دینے کا اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک قانون کو ختم کرنے کی بجائے معاشرے کو مثالی معاشرہ بنانے کی کوشش کی جائے اور افراد کی اصلاح و تربیت کرنے پر زور دیا جائے۔

دسواں اور گیارھواں اعتراض : یہ دونوں اعتراضات زنا بالجبر کے حوالے سے ہیں۔ ان میں سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ زنا بالرضا اور زنا بالجبر کی سزاؤں میں فرق ہونا چاہیے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے لیے معیارِ شہادت میں بھی فرق ہونا چاہیے۔

حدود آرڈی نینس کے خلاف مہم میں یہ تأثر بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ یہ ایک بہتان ہے۔ آرڈی نینس کی دفعہ نمبر ٦ میں واضح طور پر اس کا ذکر ہے کہ:

ایک شخص زنا بالجبر کا ارتکاب کرے گا اگر وہ کسی ایسے مرد یا کسی ایسی عورت سے مباشرت کرتا ہے جس کے ساتھ اُس کا جائز نکاح نہیں ہے' بشرطیکہ حالات مندرجہ ذیل ہوں:

ا) زیادتی کے شکار کی رضامندی کے خلاف

ب) زیادتی کے شکار کی رضامندی کے بغیر

ج) زیادتی کے شکار کی رضامندی سے' جب یہ رضامندی موت یا زخمی کرنے کا خوف دلا کر حاصل کی گئی ہو

د) زیادتی کے شکار کی رضامندی سے' جب مجرم جانتا ہو کہ اس کا اس سے جائز نکاح نہیں ہے اور زیادتی کا شکار سمجھتا ہو کہ وہ وہی شخص ہے جس کے ساتھ اس کا جائز نکاح ہے۔

پھر زنا بالجبر کے لیے سزا کو بھی زیادہ سخت کرنے کا ذکر آرڈی نینس کی اسی دفعہ کے تحت ان الفاظ میں موجود ہے:

ا) اگر وہ مرد یا عورت محصن ہے تو اسے عوام الناس کے سامنے سنگسار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

ب) اور اگر وہ مرد یا عورت محصن نہیں تو اُسے عوام الناس کے سامنے سو (۱۰۰) کوڑے لگائے جائیں گے اور کوئی دیگر سزا بھی دی جائے گی جو مقدمہ کے حالات کے مطابق عدالت مناسب سمجھے۔ یہ سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت بھی اس حوالے سے پہلے ہی نوٹس لے چکی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں مشہور مقدمہ ''رشیدہ پٹیل بنام وفاق پاکستان'' میں عدالت نے زنا بالجبر کو حرابہ سے مشابہ قرار دیا۔ حرابہ کی سزا قرآنِ حکیم میں سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئی:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر کے ٹکڑے کر دیے جائیں' یا سولی چڑھا دیے جائیں' یا اُن کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیے جائیں یا جلا وطن کر دیے جائیں۔ یہ تو دنیا میں اُن کی رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے''۔

وفاقی شرعی عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے دوران ریمارکس دیے کہ کسی خاتون کی عزت لوٹنا رقم لوٹنے سے زیادہ برا ہے' اس لیے زنا بالجبر حرابہ کی تعریف میں داخل ہے۔ زنا بالرضا اللہ کی حق تلفی ہے اور زنا بالجبر اللہ اور بندے دونوں کے حقوق کی پامالی ہے۔ یکم فروری ۱۹۹۰ء کو وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ :

''زنا بالجبر عام زنا سے بالکل ایک مختلف جرم ہے اور یہ فساد فی الارض اور حرابہ کی تعریف میں آتا ہے' اس لیے دفعہ ۸ (شہادت سے متعلق حدود آرڈی نینس کی دفعہ) میں زنا بالجبر کے لیے مطلوبہ ''چار مسلمان مردوں'' کا نصابِ شہادت قرآن وسنت کے مخالف ہونے کی وجہ سے ترمیم طلب ہے''۔

حدود آرڈی نینس کے خلاف مہم چلانے والے اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جو مغربی اقدار سے مرعوب ہیں اور اسی مغربی سوچ کے زیر اثر اسلامی تعلیمات کو خواتین پر ظلم وستم کا موجب سمجھتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خواتین کے ناموس کا سب سے بڑا محافظ دین اسلام ہے۔ یہ حقیقت اُن نومسلم خواتین کے بیانات سے بھی واضح ہوتی ہے جو مغربی تہذیب کی زیادتیوں کا شکار ہوئیں اور اب دین اسلام کی رحمت کے سایہ تلے ہیں۔ ستر وحجاب کی تعلیمات اور مخلوط محافل سے اجتناب ایک عورت کے وقار اور عصمت کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں اُن کے مطابق ایک مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ نکاح کے ذریعے ضمانت دے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے گا' زندگی بھر اُس کی حفاظت کرے گا' اسے تمام ضروریاتِ زندگی فراہم کرے گا اور بعد از وفات وہ اس کی وراثت میں شریک ہوگی' تب ہی وہ اُس عورت سے جنسی تعلق قائم کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے عورت پر اولاد کی پیدائش اور پرورش کے کٹھن بوجھ کے ساتھ ساتھ معیشت کی ذمہ داری بھی ڈال دی' اپنے تجارتی مفادات کے لیے عورت کو برہنہ کرکے اشتہاری کھلونا بنا دیا اور گھر سے باہر نکال کر اُس کی عصمت کو ایسے ناقابلِ تلافی خطرات سے دوچار کردیا کہ اب عورت کی آبروریزی اُس معاشرے میں ایک معمول بن چکی ہے۔ ان جرائم کے مرتکب عناصر عورتوں کے حقوق کی بات کس مُنہ سے کرتے ہیں؟ پاکستان میں کتنی خواتین ہیں جو حدود آرڈی نینس کے تحت قید ہیں یا سزا پا چکی ہیں؟ حال ہی میں جب صدر پرویز مشرف صاحب نے ایک آرڈی نینس کے ذریعے خواتین قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ اس آرڈی نینس کے تحت قید ہونے والی خواتین کی تعداد دیگر مقدمات کے مقابلہ میں انتہائی کم ہے۔ پھر

پاکستان کی جیلوں میں عورتوں سے کہیں زیادہ تعداد اُن مردوں کی ہے جو ناحق قید کی مشقت اٹھا رہے ہیں۔عورت کی مظلومیت کے اظہار کے درپردہ دراصل اسلام دشمن عزائم کارفرما نظرآتے ہیں۔

تجاویز

۱) حدود آرڈی نینس کے حوالے سے اعتراضات پرغور کرنے کے لیے حکومت جید علمائے کرام اور ماہرینِ قانون پر مشتمل کمیٹی تشکیل دے اوراُنہی کی سفارشات پر اگر کوئی ترمیم ضروری محسوس ہوتو کی جائے۔

۲) جوفعل معاشرے کے لیے نقصان دہ ہواُس کو روکنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اسے بس قانوناً جرم قرار دیا جائے‘ اوراس کے لیے ایک سزا مقرر کردی جائے‘ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چار قسم کی تدابیر اور بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے:

i) یہ کہ تعلیم وتربیت اور وعظ وتبلیغ کے ذریعے افراد کی ذہنیت درست کی جائے اوراُن کے نفس کی اُس حد تک اصلاح کردی جائے کہ وہ خود اُس فعل سے نفرت کرنے لگیں اور اُسے گناہ تصور کریں۔

ii) یہ کہ معاشرے میں رائے عامہ کواس گناہ یا جرم کے خلاف اس حد تک تیار کردیا جائے کہ معاشرے کا اجتماعی ضمیر ایسے جرائم کو برداشت نہ کرے اور عام لوگ اسے عیب تصور کرنے لگیں اوراس کے مرتکب سے نفرت کریں۔

iii) یہ کہ معاشرے سے ایسے تمام اسباب کا قلع قمع کردیا جائے جواس جرم کی تحریک پیدا کرنے والے ہوں اوراس کی ترغیب وتحریص دلانے والے ہوں‘ جیسے مخلوط معاشرت‘ ستر وحجاب کے احکامات کی خلاف ورزی‘ بے پردگی وبے حیائی کی ہرصورت‘ نکاح کومشکل اورمہنگا بنانے والی رسومات اورجنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرنے والے تمام امور‘ مثلاً شراب نوشی‘ رقص وموسیقی‘ فحش لٹریچر‘ عریاں تصاویر‘ بے ہودہ فلمیں اورڈرامے وغیرہ۔

iv) معاشرتی زندگی میں ایسی رکاوٹیں پیدا کردی جائیں کہ اگرکوئی شخص ان جرائم کا ارتکاب کرنا بھی چاہے تو نہ کرسکے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِیْنَ حَافِظُوْنَ لِحَدُوْدِكَ ۔ آمین!

تذکیر وموعظت

کیا چھوٹے گناہ معمولی ہوتے ہیں؟

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بعض اوقات ایک چھوٹی سی غلطی بڑی خوفناک ثابت ہوتی ہے۔ معمولی سی بے احتیاطی کا نتیجہ بڑی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ دو آدمیوں میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے' دیکھتے ہی دیکھتے وہ تلخ کلامی مسلح لڑائی میں تبدیل ہو کر نوبت قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ کسی شخص نے سگریٹ کا سلگتا ہوا ٹکڑا بے احتیاطی سے پھینک دیا' قریب کاغذ یا خشک پتے تھے' آگ بھڑک اٹھی اور آناً فاناً قابو سے باہر ہو گئی اور لاکھوں کا نقصان ہو گیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استری گرم تھی' بجلی چلی گئی' استری کا سوئچ آف کرنا یاد نہ رہا' رات گئے بجلی آ گئی' استری تیز گرم ہوئی' پاس پڑے ہوئے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور جب تک اہل خانہ کو خبر ہوئی مکان کا ایک حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ کسی نے گاڑی غلط جگہ پر پارک کر دی' ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا' کئی لوگ بر وقت اپنے اپنے کام پر نہ پہنچ سکے۔ اس طرح کئی قسم کا نقصان ہو گیا۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی معمولی بات ہے' مگر بعض اوقات اس کا نتیجہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ قیمتی جانیں چلی جاتی ہیں۔ کیلا کھاتے کھاتے اُس کا چھلکا بے احتیاطی سے راستے میں پھینک دیا' ایک آدمی کا پاؤں اُس پر پڑا' وہ بیچارہ پھسلا اور زندگی بھر کے لیے معذور ہو گیا۔

آپ نے دیکھا معمولی سی غلطی انجام کے اعتبار سے کس قدر بھیانک ثابت ہوئی۔ یہی حال گناہ کا ہے۔ ایسا گناہ جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے' اکثر اوقات ہلاکت آفریں اور تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر ہم دورِ جاہلیت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی کئی سال جاری رہنے والی لڑائیوں کی ابتدا بالکل معمولی معمولی باتوں سے ہوئی۔ اُس دَور کی مشہور لڑائی جنگ بسوس قبیلہ شیبان اور قبیلہ تغلب کے درمیان شروع ہو کر چالیس سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ اس میں فریقین کے ہزاروں آدمی قتل ہو گئے۔ یہ لڑائی اس طرح شروع ہوئی کہ ایک قبیلے کی اونٹنی نے دوسرے قبیلے کے باغ میں واقع ایک پرندے کا گھونسلہ خراب کر دیا تھا اور انڈے توڑ دیے تھے۔ اس پر باغ کے مالک نے اونٹنی کو مار ڈالا

تھا۔ بس اسی سے ایک دوسرے پر حملے شروع ہو گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ پس کسی گناہ کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ ؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

((یَا عَائِشَةُ اِیَّاکِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ طَالِبًا)) (مسند احمد)

''اے عائشہ! چھوٹے گناہوں سے بھی بچا کرو' کیونکہ اللہ عزوجل کی طرف سے اِن کی بھی باز پُرس ہوگی۔''

قرآن مجید میں ہے کہ جب آدمی کو نامۂ اعمال ملے گا تو وہ اسے دیکھ کر کہے گا:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (الکهف:٤٩)

''یہ کیسا نوشتہ ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز نہیں چھوڑی جو اِس میں درج نہ ہو!''

گویا نامۂ اعمال میں صرف بڑے بڑے گناہ ریکارڈ نہیں ہو رہے بلکہ چھوٹے گناہ بھی درج کیے جا رہے ہیں۔ محتاط طرزِ عمل ہمیشہ اچھا رہتا ہے۔ دریا میں معمولی پانی سمجھ کر اس میں قدم رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اگلے قدم پر کوئی گہرا گڑھا ہو اور وہ غرقابی کا باعث بن جائے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

لَا تُحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

''کسی چھوٹی چیز کو حقیر نہ سمجھو' کیونکہ پہاڑ چھوٹے چھوٹے کنکروں سے مل کر بنتے ہیں''۔

حضرت انس ؓ کا یہ قول بخاری شریف میں ہے کہ آج تم کئی گناہوں کو کرتے ہوئے اُن کو بال سے بھی کم سمجھتے ہو' حالانکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ مبارک میں اُن کو مہلک گناہوں میں شمار کرتے تھے۔ گناہ کو معمولی سمجھنے سے انسان اُس کے ارتکاب میں دلیر ہو جاتا ہے' حالانکہ گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے' خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو' کیونکہ برائی تو بہرحال برائی ہے۔ اور پھر معمولی کی تکرار معمولی کو بھی غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((اِیَّاکُمْ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ كَقَوْمٍ نَزَلُوْا فِیْ بَطْنِ وَادٍ فَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ وَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ حَتّٰى اَنْضَجُوْا خُبْزَتَهُمْ وَاِنَّ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ مَتٰى يُؤْخَذْ بِهَا صَاحِبُهَا تُهْلِكْهُ)) (مسند احمد)

''چھوٹے گناہوں سے بھی بچو! چھوٹے گناہوں کی مثال اُس قافلے جیسی ہے جو ایک مقام پر نازل ہوا ہو' اُن میں ہر شخص ایک ایک لکڑی لا کر جمع کرتا ہے' پھر وہ لکڑیاں اتنی ہو جاتی ہیں کہ وہ ان سے اپنا کھانا پکا لیتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) چھوٹے گناہ گرفت کے وقت انجام دینے والے کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں''۔

ظاہر ہے جس گناہ کو معمولی سمجھا جائے گا اُس کے متعلق احتیاط نہ ہو گی اور اس کا ارتکاب ہوتا رہے گا جو اُسے سنگین بنا دے گا' مگر جس گناہ کو آدمی بڑا سمجھے وہ اس کے قریب جانے سے باز رہے گا' اور اگر کبھی بڑا گناہ کر بیٹھا تو خوفِ خدا سے کانپ جائے گا' نادم ہو گا' استغفار کرے گا تو اُس کا وہی بڑا گناہ اللہ کے ہاں چھوٹا ہو جائے گا۔

فقیہہ ابواللیث سمرقندیؒ نے ''تنبیہہ الغافلین'' میں لکھا ہے کہ گناہ بڑا ہو یا چھوٹا دس عیوب سے خالی نہیں ہوتا۔ پہلا یہ کہ اس نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے مغضوب ابلیس کو خوش کیا۔ تیسرا یہ کہ جنت سے دُور ہوا۔ چوتھا یہ کہ جہنم کے قریب ہو گیا۔ پانچواں یہ کہ اس نے اپنے محبوب نفس پر ظلم کیا۔ چھٹا یہ کہ اس نے اپنے نفس کو گندا کر دیا جس کو اللہ نے پاک پیدا کیا تھا۔ ساتواں یہ کہ اس نے اپنے ہم نشین فرشتوں کو اذیت پہنچائی جو کہ اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ آٹھواں یہ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو قبر میں پریشان کیا۔ نواں یہ کہ اس نے رات اور دن کو اپنے اس برے عمل پر گواہ بنایا۔ دسواں یہ کہ اس نے تمام مخلوق سے خیانت کی (یعنی اس کے گناہ کی نحوست سے دوسری مخلوق متأثر ہوئی)۔

حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اللہ کا غضب وغصہ گناہوں میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ کسی معصیت کو چھوٹا مت سمجھو' ہوسکتا ہے اسی میں آتشِ غضب پنہاں ہو۔

بدنظری ایسا گناہ ہے کہ جسے عام طور پر گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا' اور اگر کوئی سمجھتا ہے تو بہت معمولی گناہ۔ مگر اس کی سنگینی دیکھئے۔ ابوبکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک دوست کو بعد از وفات خواب میں دیکھا۔ اُس سے پوچھا کیا معاملہ ہوا ہے؟ کہنے لگا ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکا میرے پاس سے گزرا' میں نے اس کی طرف دیکھ لیا' اس بدنظری کی پاداش میں شرم کے مارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ستر سال کھڑا رہا' پسینہ پسینہ ہو گیا تھا' پھر اللہ نے اپنے فضل سے معاف فرما دیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عابد کی بزرگی کی تعریف و شہرت سنی تو میں اُس کی زیارت کے لیے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے قبلہ کی جانب تھوک

چھینکی۔ میں اُس کی زیارت کیے بغیر واپس ہو گیا' کیونکہ جس شخص نے شریعت کے ظاہری آداب کا خیال نہیں رکھا وہ روحانی اسرار سے کب واقف ہوگا!

نیک کام کرتے وقت قبلہ رو ہونا سعادت مندی اور موجب نجات ہے' اسی طرح سمتِ قبلہ کی بے ادبی گناہ اور نحوست کا باعث ہے۔ مگر عام طور پر اس کو معمولی کام سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص قبلہ کی طرف تھوکتا ہے قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ وہی تھوک اس کی آنکھوں کے درمیان چہرہ پر بُرے داغ کی صورت میں ہوگا۔'' (ابوداوٗد)

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے :۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا فَهُوَ التُّقٰى

''تو گناہ چھوڑ دے' خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے' بس یہی تقویٰ ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے بعض بظاہر چھوٹے چھوٹے اعمال پر بڑے ثواب کی خوشخبری سنائی ہے یا چھوٹے سے عمل پر بہت زیادہ اجر و ثواب کی خبر دی ہے۔ بعض لوگ ایسی احادیث کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور استہزاء کرتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ کسی معمولی عمل پر بہت زیادہ اجر و ثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح وہ کسی بظاہر چھوٹے سے عمل پر گرفت کرلے تو اس کا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا۔ امام طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم طالب علمی کے دور میں شہر بصرہ کی ایک گلی میں سے گزر کر تیز تیز چلتے ہوئے اپنے استاد کے پاس جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک غیر سنجیدہ طالب علم تھا' وہ اُس حدیث کا مذاق اڑاتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ طالب علم کے قدموں کے نیچے فرشتے پَر بچھاتے ہیں' کہنے لگا کہ اپنے قدموں کو اٹھا لو کہیں تم فرشتوں کے پَر نہ توڑ دو۔ اس نے مذاق کے انداز میں یہ بات کہی ہی تھی کہ اس کے پاؤں وہاں سے ہل نہ سکے' اس کی ٹانگیں سوکھ گئیں اور وہ زمین پر گر پڑا''۔ پس احکامِ شریعت یا قرآن وحدیث کی باتوں کی تحقیر اور اُن پر استہزاء کے انداز میں تبصرہ سے بچنا چاہیے۔

گناہ تو چھوٹا ہو یا بڑا آخر گناہ ہی ہے۔ پرہیز گار تو وہ ہیں جو مشکوک چیز سے بھی دُور رہتے ہیں کہ کہیں اُس کا تعلق گناہ سے نہ ہو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ

3

مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ)) (صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاۃ)

''یقیناً جو حلال ہے وہ واضح اور روشن ہے اور جو حرام ہے وہ بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں، بہت سے لوگ ان (کے شرعی حکم) کو نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بھی (احتیاطاً) پرہیز کرے وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لے گا اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑے گا تو وہ حرام کی حدود میں جا گرے گا''۔

ترمذی شریف کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ:

''بندہ متقی اس وقت ہوتا ہے جب ان جائز امور کو بھی ترک کر دے جن کے ذریعے آگے ناجائز امور میں پڑنے کا خطرہ ہو''۔

جب شبہ والی چیز سے بھی دُور رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو گناہ کی بات کا تو کسی طور پر بھی ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

واصنع کماش فوق ارض الشوک یحذر ما یری

یعنی ایسی زندگی گزار جس طرح کوئی شخص خاردار زمین پر چلتے ہوئے ہر چیز سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے بیت الخلاء سے نکلتے ہوئے غلطی سے بایاں قدم باہر رکھ دیا تو فوراً بے ہوش ہو گئے کہ حدیث کی مخالفت سرزد ہو گئی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو یہ ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں پہلے اندر رکھو اور نکلتے وقت دایاں پاؤں پہلے باہر نکالو، جبکہ مسجد کا حکم اس کے برعکس ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((دَخَلَتِ امْرَأَۃٌ النَّارَ فِیْ هِرَّۃٍ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْکُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ)) (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق)

''ایک عورت ایک بلی (نہایت ظالمانہ طریقے سے) مار ڈالنے کے جرم میں آگ میں داخل ہوئی۔ اس نے اس بلی کو باندھ لیا، پھر نہ تو خود اسے کھانے کو کچھ دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ حشرات الارض سے اپنا پیٹ بھر لیتی''۔

جب انسان پر غسل فرض ہو جائے تو جلد از جلد پاکیزگی اختیار کر لینی چاہیے، کیونکہ جُنبی

آدمی نہ نماز پڑھ سکتا ہے‘ نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ قرآن مجید کو چھو سکتا ہے۔ اس لیے جنابت کی حالت میں رہنا گناہ کی حالت میں رہنا ہے۔ ایک شخص نے کسی کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں نظر آنے والے نے کہا مجھے چھوڑ دیجیے‘ میں بری حالت میں ہوں‘ کیونکہ ایک دفعہ میں نے غسلِ جنابت نہیں کیا تھا جس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے آگ کا کپڑا پہنا دیا‘ اس آگ کے لباس میں دن رات سرگرداں ہوں۔

کسی آدمی نے ایک فوت شدہ نمازی کو خواب میں دیکھا اور پوچھا موت کے بعد تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے ایک دن وضو کے بغیر نماز پڑھی تھی جس کی سزا مجھے یہ ملی کہ ایک بھیڑیا مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے جو مجھے ہر وقت قبر میں ڈراتا رہتا ہے۔ اِس خوفناک صورتِ حال کی وجہ سے میں بہت بری حالت میں ہوں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے‘ کیونکہ ناجائز لقمہ نری ہلاکت ہے۔ بزرگانِ دین اور صلحائے اُمت نے اس ضمن میں قابل تقلید مثالیں چھوڑی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ ایک بار کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دودھ پیش کیا۔ آپؓ نے پی لیا۔ پھر اس آدمی سے پوچھا کہ یہ دودھ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟ اس نے کہا میں ایک چشمے پر گیا‘ وہاں صدقہ کی اونٹنیوں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ شتر بانوں نے ان کا دودھ دوہا اور اس میں سے کچھ مجھے بھی دیا۔ وہی دودھ میں نے لا کر آپؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اُنگلی اپنے حلق میں ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا‘ کیونکہ وہ بیت المال کی اونٹنیوں کا اتنا سا دودھ بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ایک صالح نوجوان نہر کے کنارے سفر کر رہا تھا۔ نہر میں ایک سیب تیرتا ہوا آ رہا تھا‘ اُس نے پکڑا اور کھا لیا۔ بعد ازاں خیال آیا کہ نہ معلوم یہ سیب کس کا تھا‘ اور میں نے مالک کی مرضی کے بغیر کھا لیا! اسی فکر میں آگے جا رہے تھے کہ دیکھا کہ نہر کے کنارے ایک باغ ہے جس کے درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی ہیں۔ سمجھ گئے کہ وہ سیب اسی باغ کے درخت سے پانی میں گرا تھا۔ چنانچہ وہ صالح نوجوان اس باغ کے مالک کے پاس گیا اور کہا میں نے آپ کے باغ کا ایک سیب جو کہ نہر کے پانی میں بہا جا رہا تھا‘ آپ کی اجازت کے بغیر کھا لیا ہے‘ آپ مجھے یہ خطا معاف کر دیں۔ باغ کا مالک بھی صاحب ادراک تھا۔ کہنے لگا میں تو معاف نہیں کروں گا۔ جب نوجوان نے منت سماجت کی تو کہنے لگا کہ معافی کی ایک صورت ہے‘ اور وہ یہ کہ میری بیٹی سے نکاح کر لو جو آنکھوں سے اندھی‘ کانوں سے بہری اور ٹانگوں سے

معذور ہے۔ نوجوان نے چاروناچار یہ شرط منظور کر لی۔ نکاح ہو گیا۔ جب نوجوان نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس کے اندر کوئی بھی جسمانی عیب نہ تھا' وہ حیران ہوا اور لڑکی کے والد سے پوچھا کہ لڑکی نہ تو اندھی ہے' نہ بہری ہے اور نہ معذور ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میری لڑکی اندھی اِس معنی میں ہے کہ اس نے کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا۔ بہری اِس معنی میں ہے کہ اس کے کان ناجائز اور حرام آوازوں سے پاک رہے۔ ٹانگوں سے معذور ہونے کا مطلب ہے کہ یہ کسی معصیت کے کام کی طرف چل کر کبھی نہیں گئی۔ یہ صالح نوجوان اور اس کی خوش خصال اور پاک دامن بیوی ہی وہ جوڑا ہے جن کے ہاں حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک عقیدت مند انہیں ملنے کے لیے آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ٹرین میں سوار ہو کر عازمِ سفر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ جلدی سے ٹکٹ بھی نہ خرید سکا۔ جب ٹرین کے ڈبے میں ٹکٹ چیک کرنے والا آیا تو نوجوان نے کہا کہ میں جلدی میں سوار ہو گیا ہوں اور ٹکٹ نہیں لے سکا' آپ مجھے ٹکٹ دے دیں۔ ٹکٹ چیکر نے نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے معصوم سا چہرہ جس پر خوبصورت داڑھی تھی' بھلا معلوم ہوا' کہنے لگا نوجوان! ٹکٹ کی ضرورت نہیں' جہاں آپ اترنا چاہیں اتر جائیں۔ نوجوان مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور سفر ختم کر کے سٹیشن پر اتر گیا۔ مولانا تھانویؒ سے ملاقات ہوئی تو ضمناً سفر کا ذکر بھی آ گیا تو نوجوان نے ساری روئیداد بتا دی۔ مولانا نے کہا کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگرچہ ٹکٹ چیکر نے آپ کو کرایہ معاف کر دیا' مگر وہ تو کرایہ معاف کرنے کا مجاز نہ تھا۔ وہ ریل کا ملازم تھا۔ آپ نے کرایہ نہ دے کر محکمۂ ریلوے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب اتنی رقم کا ریل کا ٹکٹ خرید کر ضائع کر دو' متعلقہ محکمے کو کرایہ کی رقم پہنچ جائے گی۔

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگرچہ قرآن وحدیث میں کچھ گناہوں کو چھوٹا اور کچھ کو بڑا کہا گیا ہے' مگر ہمیں تفصیلی طور پر اِن گناہوں کی تاثیر کا علم نہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑے گناہ کا انجام اِس قدر خطرناک اور ہلاکت خیز نہیں ہوتا جتنا کسی چھوٹے گناہ کا' لہٰذا جو کام گناہ کا ہے' خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اُس سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

@

1

مُحَرَّمات (۵)

(حرام اُمور‘ جن سے بچنا ضروری ہے)

حافظ محمد زبیر

(۳۱) اِختلاطِ مَرد وزَن

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شریعتِ اسلامیہ میں مَرد اور عورت کا دائرۂ کار علیحدہ علیحدہ مقرر کیا ہے۔ عورت کا اصل دائرۂ کار اُس کا گھر ہے‘ اگرچہ ضرورت کے تحت اس کو گھر سے باہر نکلنے کی بھی اجازت ہے۔ جبکہ مرد کا دائرۂ کار گھر سے باہر کے کام کاج ہیں۔ عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شوہر کے بچوں کی تربیت کرے‘ اس کے مال کی حفاظت کرے‘ اس کے گھر کے کام کاج کو سنبھالے‘ جبکہ مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ کا بندوبست کرے۔ اسلام نے معاش کی ذِمہ داری مرد پر ڈالی ہے نہ کہ عورت پر‘ اس لیے مرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ اللہ کے رسولﷺ کی بہت ساری احادیث ہمیں ایسی ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے مختلف مواقع پر کسی ضرورت کے تحت پیدا ہونے والے مَرد وزَن کے اختلاط میں کیسے کیسے رہنمائی فرمائی ہے۔

عصر حاضر کے بعض متجدّ دین مَرد وزَن کے اختلاط کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے اُن کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہﷺ کے زمانے میں بھی نماز اور حج کے موقع پر مَرد اور عورتیں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مَرد وزَن کے اختلاط سے سوائے فتنے کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتا‘ خصوصاً جبکہ عورتیں مکمل حجاب میں بھی نہ ہوں۔ آپؐ نے ایک مرتبہ عورتوں کو دیکھا کہ وہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گھروں کو جاتے وقت راستے کے درمیان چل رہی تھیں جس کی وجہ سے مَردوں سے اُن کا اختلاط ہو رہا تھا تو آپؐ نے اُس موقع پر اُن کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا:

((عَلَیْکُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِیْقِ)) فَکَانَتِ الْمَرْاَۃُ تَلْتَصِقُ بِالْجِدَارِ حَتّٰی اِنَّ ثَوْبَھَا لَیَتَعَلَّقُ بِالْجِدَارِ مِنْ لُصُوْقِھَا بِہٖ[۱]

''راستے کے کنارے پر چلو''۔ (راوی کہتے ہیں) اس کے بعد عورت دیوار کے ساتھ اس طرح لگ کر چلتی تھی کہ اُس کے کپڑے دیوار کے ساتھ چمٹ جاتے تھے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ عورتوں کے مَردوں کے ساتھ اختلاط کے معاملے میں کس درجے احتیاط کرتے تھے کہ ان کو ایک ساتھ مل کر چلنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ جہاں تک آپ ﷺ کے زمانے میں نماز اور حج کے موقع پر مَرد وزَن کے اختلاط کا تعلق ہے تو وہ اختلاط ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل شادی بیاہ کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کے زمانے میں نماز و حج کا اختلاط ایک مذہبی نوعیت کا اختلاط تھا اور ضرورت کے تحت اس کو جائز قرار دیا گیا' لیکن اس میں بھی متعدد ایسی پابندیاں تھیں جن کی طرف عام لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔

نماز کا اختلاط

۱) رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے میں عورتوں کو مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی' لیکن اس کو افضل قرار نہ دیا تھا۔ حضرت اُمّ حمید الساعدیہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی ہیں کہ میں آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے آپ ؐ کے ساتھ نماز پڑھنا بہت محبوب ہے' تو آپ ؐ نے فرمایا:

((عَلِمْتُ اَنَّکِ تُحِبِّیْنَ الصَّلَاۃَ مَعِیَ وَصَلَاتُکِ فِیْ بَیْتِکِ خَیْرٌ لَّکِ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ حُجْرَتِکِ وَصَلَاتُکِ فِیْ حُجْرَتِکِ خَیْرٌ لَّکِ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ دَارِکِ وَصَلَاتُکِ فِیْ دَارِکِ خَیْرٌ لَّکِ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ مَسْجِدِ قَوْمِکِ وَصَلَاتُکِ فِیْ مَسْجِدِ قَوْمِکِ خَیْرٌ لَّکِ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ مَسْجِدِیْ[۲]))

''مجھے یہ معلوم ہے کہ تمہیں میرے ساتھ نماز پڑھنا بہت زیادہ محبوب ہے' لیکن تیری اپنے گھر کے کسی رہائشی کمرے کی نماز تیری اپنے گھر کے صحن کی نماز سے بہتر ہے' اور تیرا اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھنا اپنی حویلی میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے' اور تیرا اپنی حویلی میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تیرا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔''

۲) اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھنے والوں کی صفوں کے بارے

میں فرمایا:

((خَیْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا وَشَرُّهَا آخِرُهَا وَخَیْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا))[۳]

''مردوں کی سب سے بہتر صف وہ ہے جو سب سے پہلی ہے اور سب سے بدتر صف وہ ہے جو کہ آخری ہے (کیونکہ یہ عورتوں کے نزدیک ہے)' اور عورتوں کی بہترین صف سب سے آخری صف ہے اور بدترین صف سب سے پہلی صف ہے (کیونکہ یہ مردوں کے نزدیک ہے)۔''

۳) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں اُن نمازوں کے لیے مسجد میں آتی تھیں جو کہ اندھیرے میں ہوتی ہیں' مثلاً فجر' مغرب اور عشاء۔ آپ ﷺ کی حدیث ہے:

((اِئْذَنُوْا لِلنِّسَاءِ بِاللَّیْلِ اِلَی الْمَسَاجِدِ))[٤]

''(اپنی) عورتوں کو رات کے اوقات میں نماز کے لیے نکلنے کی اجازت دو۔''

۴) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں جب نماز کے لیے آتی تھیں تو مکمل حجاب کے ساتھ آتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

کُنَّ نِسَاءُ الْمُؤْمِنَاتِ یَشْهَدْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ ثُمَّ یَنْقَلِبْنَ اِلٰی بُیُوْتِهِنَّ حِیْنَ یَقْضِیْنَ الصَّلَاةَ لَا یَعْرِفُهُنَّ اَحَدٌ مِّنَ الْغَلَسِ[٥]

''عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز میں حاضر ہوتی تھیں اِس حال میں کہ انہوں نے اپنے سارے جسم کو اچھی طرح اپنی چادروں میں لپیٹا ہوتا تھا' پھر وہ نماز ادا کرنے کے بعد اپنے گھروں کو جاتیں' اور ان کو اندھیرے کی وجہ سے کوئی بھی پہچان نہ سکتا تھا۔''

یعنی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ عورت جا رہی ہے یا مرد۔

۵) اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے زمانے میں مسجد میں عورتوں کے داخل ہونے کے لیے الگ دروازہ مقرر کر دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ تَرَکْنَا هٰذَا الْبَابَ لِلنِّسَاءِ)) قَالَ نَافِعٌ تِلْمِیْذُ ابْنِ عُمَرَ فَلَمْ یَدْخُلْ مِنْهُ ابْنُ عُمَرَ حَتّٰی مَاتَ[٦]

''کاش کہ ہم مسجد کا یہ دروازہ عورتوں کے لیے مخصوص کر دیں!'' امام نافع جو کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں' فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات تک اُس دروازے سے مسجد نبویؐ میں کبھی بھی داخل نہ ہوئے۔''

٦) بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عورتوں کے مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کو ناپسند بھی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں:

لَوْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم رَأَی مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسْجِدَ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِیْ اِسْرَاءِ یْلَ (٧)

''اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آج کل کی عورتوں کی حالت دیکھ لیتے تو لازماً ان کو مسجد میں جانے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا۔''

یہ نماز کا وہ اختلاط ہے کہ جس کو عصر حاضر کے نام نہاد سکالرز آج کل کے گناہ' عریانی' فحاشی' بدکاری' بے حیائی اور اللہ کی نافرمانی پر مشتمل مخلوط اجتماعات کے لیے بطورِ دلیل استعمال کرتے ہیں۔ کہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دَورِ مبارک میں باپردہ خواتین کا رات کے اوقات میں مسجد نبویؐ میں جا کر مَردوں سے علیحدہ جگہ پر نماز پڑھنا اور کہاں آج کل کی رقص و سرود کی مخلوط محفلیں! کس کی عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابیات کے پاکیزہ اور مذہبی اجتماعات پر آج کل کی کفر وشرک اور عریانی و فحاشی پر مبنی محافل کو قیاس کرے' سوائے اُس شخص کے کہ جس کی شیطان نے مت ماردی ہو؟

حج میں اختلاط

حج میں جو اختلاط ہے یہ بھی ایک ضرورت کے تحت ہے۔ بہت سے آثارِ صحابہؓ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابیاتؓ حج کے موقع پر' خصوصاً طواف میں بھی' اختلاط سے ممکن حد تک بچنے کی کوشش کرتی تھیں۔ حضرت ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عطا نے خبر دی کہ جب ابنِ ہشام نے عورتوں کو مردوں کے ساتھ طواف کرنے سے روکنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا:

كَيْفَ يَمْنَعُهُنَّ وَقَدْ طَافَ نِسَاءُ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم مَعَ الرِّجَالِ؟ قُلْتُ اَ بَعْدَ الْحِجَابِ اَوْ قَبْلُ؟ قَالَ اِیْ لَعَمْرِیْ لَقَدْ اَدْرَكْتُهُ بَعْدَ الْحِجَابِ' قُلْتُ كَيْفَ يُخَالِطْنَ الرِّجَالَ؟ قَالَ لَمْ يَكُنَّ يُخَالِطْنَ كَانَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا تَطُوْفُ حَجْرَةً مِّنَ الرِّجَالِ لَا تُخَالِطُهُمْ (٨)

''وہ عورتوں کو کیسے منع کرے گا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مَردوں کے ساتھ طواف

3

کرتی تھیں؟ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطا سے کہا: کیا حجاب کی آیت کے نزول کے بعد بھی ایسا ہوا ہے یا یہ آیتِ حجاب کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے؟ تو عطا نے کہا: میری عمر کی قسم! یہ واقعہ آیت حجاب کے نزول کے بعد کا ہے۔ تو میں نے سوال کیا کہ وہ مردوں کے ساتھ کیسے اختلاط کر لیتی تھیں؟ عطا نے جواب دیا کہ وہ مردوں کے ساتھ اختلاط نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مَردوں سے الگ ہو کر طواف کیا کرتی تھیں۔''

ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ امام فاکہی نے اپنی کتاب ''کتاب مکہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کو مَردوں کے ساتھ طواف کرنے سے منع کیا تھا۔ امام فاکہی حضرت ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

نَهٰى عُمَرُ اَنْ يَّطُوْفَ الرِّجَالُ مَعَ النِّسَاءِ، قَالَ : فَرَأٰى رَجُلًا مَعَهُنَّ فَضَرَبَهٗ بِالدُّرَّةِ

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ طواف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو عورتوں کے ساتھ طواف کرتے دیکھا تو اس کو کوڑے سے مارا۔''

اِس قسم کے بہت سے آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اختلاطِ مَرد و زَن کو پسند نہیں کرتا اور ممکن حد تک اس سے دُور رہنے کی تعلیم دیتا ہے، سوائے ان جگہوں کے جہاں پر اِس قسم کا اختلاط ضرورت یا اضطرار کے تحت جائز ہو، اور حج بھی اسی قسم کا ایک موقع ہے کہ جہاں ضرورت اور اضطرار کے تحت اختلاط کو جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے: **الضرورات تبیح المحظورات** ''ضرورتیں حرام افعال کو مباح بنا دیتی ہیں۔''

(۳۲) حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف بیٹا ہونے کی نسبت کرنا

کسی مسلمان کے لیے یہ بالکل بھی جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی طرف بیٹا یا بیٹی ہونے کی نسبت کرے جو کہ درحقیقت اس کا باپ نہیں ہے۔ ہمارے معاشروں میں لوگ عموماً یتیم خانوں سے بچے اٹھا لاتے ہیں اور ان کے باپ کے طور پر اپنا نام ان کے کاغذات

میں لکھوا دیتے ہیں‘ حالانکہ وہ اُن کے حقیقی بچے نہیں ہوتے‘ بلکہ مُنہ بولے بچے ہوتے ہیں۔ایسا کرنا شرعاً حرام ہے۔حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ))(۹)

’’جس نے اپنی نسبت جانتے بوجھتے اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کی تو اُس پر جنت حرام ہے۔‘‘

اسی طرح احادیث میں اُس شخص کے بارے میں بھی سخت وعید آئی ہے جوکہ اپنی اولاد کو اولاد ماننے سے انکار کردیتا ہے‘ حالانکہ اس کے پاس اس کی کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((اَیُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَہٗ وَھُوَ یَنْظُرُ اِلَیْہِ احْتَجَبَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ مِنْہُ وَفَضَحَہٗ عَلٰی رُءُ وْسِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ))(۱۰)

’’جس کسی نے بھی اپنی اولاد کا انکار کیا اس حال میں کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہی ہو‘ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے پردہ فرمائیں گے اور اسے پہلی اور پچھلی قوموں کے درمیان ذلیل ورسوا کریں گے۔‘‘

’’وَھُوَ یَنْظُرُ اِلَیْہِ‘‘ سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ’’وہ بچہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو‘‘ اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ’’وہ آدمی اس بچے کی طرف دیکھ رہا ہو‘‘ یعنی وہ جانتا ہو کہ وہ اُسی کی اولاد ہے۔

(۳۳) سود کھانا

کبیرہ گناہوں میں کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اعلانِ جنگ کیا ہو سوائے سود کے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (البقرۃ:۲۷۸‘۲۷۹)

’’اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور جو بھی سود سے باقی ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مؤمن ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔‘‘

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی معاملات میں تعاون کرنے والوں پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم آکِلَ الرِّبَا وَمُؤْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ وَقَالَ: ((ھُمْ سَوَاءٌ)) [11]

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور اُن کے بارے میں فرمایا کہ ''وہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

اسی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے بینک کی ملازمت کو ناجائز قرار دیا ہے' کیونکہ سود کا لکھنا اور سودی معاملات پر گواہ بننا بھی اتنا ہی حرام ہے جتنا کہ سود کھانا اور کھلانا۔ فی زمانہ ملازمتوں کے حصول میں جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ ہمارے سامنے واضح ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بینک ملازمین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کرنے کے لیے کسی دوسری ملازمت یا کاروبار کے لیے کوشاں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور اُن کے لیے راستے کھولے گا۔ اگر وہ کسی دوسری ملازمت یا کاروبار کے لیے سوچتے بھی نہیں ہیں تو اللہ کی مدد کیسے آ جائے گی اور ان کو گھر بیٹھے کسی دوسری ملازمت کی آفر کیسے ہو جائے گی؟ تقویٰ اور احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بینک جس طرح سے سودی معاملات اور کاروبار میں جکڑے ہوئے ہیں ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔

(۳۴) خرید وفروخت کے وقت دکان دار کا مال کے عیب کو چھپانا

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانے (غالباً گندم) کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا' آپؐ نے اس میں اپنا ہاتھ مبارک ڈالا تو آپؐ کو اندر سے وہ گیلا محسوس ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

((مَا ھٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟)) قَالَ: اَصَابَتْہُ السَّمَاءُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ' قَالَ: ((اَفَلَا جَعَلْتَہٗ فَوْقَ الطَّعَامِ کَیْ یَرَاہُ النَّاسُ؟ مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) [12]

''اے کھانے کے مالک! یہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس کو بارش پہنچی تھی (اس لیے یہ اندر سے گیلا ہے) تو آپؐ نے فرمایا: ''تو نے اسے کھانے کے اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ اسے دیکھیں؟ جس نے ملاوٹ کی اُس کا مجھ سے کوئی

تعلق نہیں۔''

آج کل ہم بازار میں دیکھتے ہیں کہ اکثر دکان دار حضرات اچھا مال دکھا کر گاہک کو گھٹیا مال پکڑا دیتے ہیں۔ مزید برآں اس حرکتِ بد پر فخر محسوس کرتے اور اپنے آپ کو تجربہ کار کہتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ایسے دکان داروں کے بارے میں یہ فرمان ہے کہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، یعنی ایسے دھوکے باز میری اُمت میں سے نہیں ہیں۔

اگر کسی چیز کا عیب گاہک پر واضح کر دیا جائے تو پھر اُس کو بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ بَاعَ مِنْ اَخِيْهِ بَيْعًا فِيْهِ عَيْبٌ اِلَّا بَيَّنَهُ لَهُ))(١٣)

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو کوئی ایسی چیز بیچے جس میں عیب ہو، سوائے اس کے کہ وہ اس عیب کو اس کے لیے واضح کر دے۔''

جب تک گاہک کوئی چیز خرید کر دکان سے چلا نہ جائے اُس وقت تک دکان دار اور خریدار دونوں کے پاس یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ وہ اپنے سودے سے پھر جائیں۔ لیکن جب گاہک کوئی چیز خرید کر چلا جائے تو پھر اُس کے بعد یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی اگر دوسرے فریق کو دھوکہ دینے کی کوشش کرے گا تو اُس سودے سے برکت ختم ہو جائے گی، اگرچہ گناہ صرف اسی کو ہو گا جس نے دھوکہ دیا یا جھوٹ بولا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا —— اَوْ قَالَ: حَتّٰى يَتَفَرَّقَا —— فَاِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا، وَاِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))(١٤)

''بیچنے اور خریدنے والے کے پاس اُس وقت تک چیز کو واپس کرنے کا اختیار ہوتا ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہو جائیں۔ اگر وہ دونوں سچ بولیں گے اور عیب کو ظاہر کریں گے تو اُن کے لیے اس بیع میں برکت ڈال دی جائے گی۔ اور اگر وہ دونوں عیب کو چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے تو اُن کی بیع میں برکت ختم کر دی جائے گی۔''

5

(۳۵) بیع نجش

اللہ کے رسولﷺ نے قیمت بڑھانے کی خاطر بولی لگانے سے منع کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

((لَا تَنَاجَشُوْا)) [۱۵] ''آپس میں قیمت بڑھانے کے لیے بولی نہ لگاؤ۔''

''نجش'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو بکتا ہوا دیکھے تو خواہ مخواہ اس کی قیمت بڑھا دے۔ اُس قیمت بڑھانے والے کا مقصد اُس چیز کو خریدنا نہ ہو بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہو کہ یہ چیز مہنگے داموں بک جائے۔ بعض اوقات یہ قیمت بڑھانے والے دکان دار کے ساتھ مل کر گاہک کو پھنسانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں دکان دار اور ایسی بولی لگانے والا دونوں اس گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ بعض اوقات دکان دار تو اس فعل میں شریک نہیں ہوتا لیکن قیمت بڑھانے والا اس نیت سے قیمت بڑھاتا رہتا ہے کہ خریدار کو نقصان ہو۔ ایسی صورت میں صرف قیمت بڑھانے والا ہی گناہ گار ہوگا۔ امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

هٰذَا حَرَامٌ بالاجماع، والبیع صحیح، والاثم مختص بالناجش ان لم یعلم به البائع، فان واطأه علی ذلک اثما جمیعا [۱۶]

''بیع نجش کی حرمت پر علماء کا اجماع ہے، لیکن یہ بیع ہو جاتی ہے، اگرچہ ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا، اور گناہ اس کو ہوگا جس نے قیمت بڑھائی بشرطیکہ دکان دار کو اس کا علم نہ ہو، اگر دکان دار بھی ساتھ ملا ہوا ہو تو دونوں گناہ گار ہوں گے۔''

اس بیع کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خریدار کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ اور دھوکے کی اسلام میں قطعی ممانعت ہے۔

(۳۶) جمعہ کی اذان کے بعد خرید و فروخت کرنا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے بعد ہر قسم کی تجارت اور خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ۭ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الجمعة)

''اے اہل ایمان! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان ہو جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑے چلے آؤ اور ہر قسم کی تجارت اور کاروبار کو چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

دیکھنے میں آ رہا ہے کہ لوگ نمازِ جمعہ کی اذان کے بعد بھی اپنے کاروبار اور دُنیوی مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اور مسجد میں نہیں آتے۔ حالانکہ جمعہ کی نماز جتنی ضروری ہے اتنا ہی جمعہ کا خطبہ سننا بھی ضروری ہے۔ جمعہ کے خطبے کا اصل مقصد وعظ و نصیحت ہوتا ہے کہ ہر ہفتے انسان کی یاد دہانی کا ایک سلسلہ قائم رہے اور اُس کے عمل میں سستی پیدا نہ ہو۔ لیکن اکثر افراد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے لیے عین جماعت کے وقت آتے ہیں اور دو رکعتیں فرض پڑھ کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اس آیت مبارکہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اذانِ جمعہ کے بعد ہر قسم کے دُنیوی مشاغل کو چھوڑ کر جمعہ کے لیے گھر سے نکل پڑنا چاہیے۔ الّا یہ کہ کوئی شخص جمعہ کی تیاری میں مصروف ہو تو اسے جلد از جلد تیاری مکمل کر کے مسجد کی طرف چل پڑنا چاہیے۔

(۳۷) چوری کرنا

چوری کرنا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے' جس کی حد ہاتھ کاٹنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾﴾ (المائدۃ)

''اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت' ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو' یہ بدلہ ہے اس کا جو انہوں نے کمایا اور اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

چوری بہرحال چوری ہی ہوتی ہے چاہے تھوڑے مال کی ہو یا زیادہ مال کی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَعَنَ اللّٰهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ وَيَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ)) (۱۷)

''اللہ تعالیٰ اُس چور پر لعنت کرے جو کہ انڈا چوری کرتا ہے اور اُس پر اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا

ہے اور رسّی چوری کرتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔‘‘

کسی سرکاری ادارے مثلاً سکول‘ کالج‘ یونیورسٹی وغیرہ کے فنڈز رکھا جانا بھی چوری میں آتا ہے۔ چونکہ سرکاری مال مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہے اس لیے اس کو ذاتی استعمال میں لانا حرام ہے۔ سرکاری مال کو سرکاری محکموں میں خواہ وہ پولیس ہو یا فوج‘ واپڈا ہو یا سوئی گیس‘ غرض ہر محکمے میں ناجائز استعمال کیا جاتا ہے‘ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام الناس کی بہت بڑی تعداد بنیادی سہولیات مثلاً بجلی‘ پانی‘ گیس‘ ہسپتال‘ سڑکوں‘ تعلیم وغیرہ سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تو ہمارے ہاں سسٹم کی خرابی ہے‘ لیکن ایک دوسری بڑی وجہ جہالت بھی ہے کہ لوگ سرکاری فنڈز کے ذاتی استعمال کو چوری سمجھتے ہی نہیں۔ اس لیے دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے دین دار حضرات بھی اس فعل میں ملوث ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھ کر استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

(۳۸) رشوت لینا اور دینا

قاضی‘ یا حاکم یا کسی سرکاری ملازم کو اس وجہ سے رشوت دینا کہ وہ باطل کو حق کر دے یا باطل کو چھپا لے‘ تو یہ ایسا جرم ہے جو کسی دوسرے بھائی پر ظلم وستم کرنے کے مترادف ہے اور فتنہ وفساد پھیلانے کا موجب ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۸۸﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ اور ان کو حکام کی طرف نہ لے جاؤ کہ تم لوگوں کے مال میں سے ایک حصہ کھا سکو گناہ کے ساتھ اور تم جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہو۔‘‘

ہمارے ہاں رشوت کا مرض بہت زیادہ عام ہو گیا ہے‘ خصوصاً سرکاری محکموں کا تو یہ حال ہے کہ جائز حق وصول کرنے کے لیے بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ اپنے کسی حق کے حصول کے لیے یا اپنے اوپر ہونے والے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجبوراً رشوت دینا اس وعید میں داخل نہیں ہے جو کہ قرآن وسنت میں وارد ہوئی ہے۔ ہاں اگر رشوت لینے یا دینے سے اصل مقصود کسی پر ظلم کرنا ہو‘ یا کسی کا حق مارنا ہو‘ یا اپنے جرم کو چھپانا ہو یا قوم کا پیسہ ہڑپ کرنا وغیرہ ہو تو ایسی تمام صورتوں میں رشوت لینا اور دینا حرام ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کا

ارشاد ہے:

((لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ))(۱۸)

''رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔''

(۳۹) کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا

کسی کی زمین پر ظلم و زیادتی سے قبضہ کر لینا بہت بڑا جرم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَیْئًا بِغَیْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلٰی سَبْعِ اَرَضِیْنَ))(۱۹)

''جس نے کسی کی زمین کو ناحق دبایا تو ایسے شخص کو قیامت کے دن سات زمینوں کے نیچے تک دھنسا دیا جائے گا۔''

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((مَنْ ظَلَمَ قِیْدَ شِبْرٍ مِنَ الْاَرْضِ طُوِّقَهٗ مِنْ سَبْعِ اَرَضِیْنَ))(۲۰)

''جس نے کسی دوسرے کی بالشت برابر زمین بھی ظلم و زیادتی سے چھین لی تو قیامت کے دن سات زمینوں کو اُس کی گردن میں طوق بنا کر ڈالا جائے گا۔''

ایک طرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن وعیدوں کو دیکھیں اور دوسری طرف معاشرے میں موجود قبضہ گروپوں کو دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اسلامی تعلیمات سے کس قدر اعراض کر رہے ہیں! پچھلے ہی دنوں ایک معروف اخبار میں قبضہ گروپ کے خلاف ایک تحقیقی رپورٹ چھپی ہے جس میں قبضہ گروپوں کے طریقۂ واردات اور عام شہریوں پر اِن کے مظالم اور اُن کی نمائندگی کرنے والے سرکاری عناصر کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ رپورٹ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پاکستان میں کس قدر تیزی سے قبضہ گروپ عوام الناس کی زمینوں پر ظالمانہ قبضہ کر کے اُن پر بڑے بڑے پلازے اور عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں! طرفہ تماشا یہ کہ یہ سب کچھ سرکار کی نگرانی اور ملی بھگت سے ہو رہا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسے شخص پر بھی لعنت فرمائی ہے جو کہ زمین کی حدود کو تبدیل کر دیتا ہے تاکہ اپنے پڑوسی کی جگہ کا کچھ حصہ اپنی جگہ میں ملا سکے۔ یہ کام چاہے کوئی پٹواری یا تحصیلدار کرے یا خود زمین کا مالک کرے' دونوں صورتوں میں حرام ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ غَیَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ))[۲۱]

''اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر لعنت فرمائے جس نے زمین کی علامات (یا حدود) کو تبدیل کر دیا۔''

جوا (۴۰)

جوا بھی شریعت اسلامیہ میں حرام ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۹۰﴾ (المائدۃ)

''اے اہل ایمان! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں، سو اِن سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

دَورِ جاہلیت میں اہل عرب کی بری عادات میں جوا بھی شامل تھا، جس کی معروف شکل اُن کے ہاں یہ ہوتی تھی کہ دس افراد ایک اونٹ میں مساوی طور پر شریک ہوتے، پھر تیروں کے ذریعے قرعہ نکالتے اور سات افراد اس اونٹ کے گوشت میں سے معین حصہ لے لیتے جبکہ باقی تین افراد محروم رہ جاتے۔ اکثر اوقات اس طرح سے حاصل شدہ گوشت کو غریبوں اور مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح غرباء کا بھی کچھ نہ کچھ بھلا ہو جاتا تھا۔ جوئے کے اندر یہی وہ منفعت تھی کہ جس کی طرف قرآن نے اِن الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''اور اِن دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔''

موجودہ دَور میں بھی جوئے کی ایک معروف شکل تاش کے پتوں(play cards) پر جوا کھیلنا ہے، لیکن عصر حاضر کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ سود اور جوئے کی بہت ساری ایسی شکلیں معاشرے میں رواج پا گئیں ہیں کہ لوگ اِن کو سود اور جوا ہی نہیں سمجھتے۔ مثلاً قسمت کی پڑیا، لاٹری کی تمام صورتیں، اخبارات کے پزل، مختلف قسم کے ریفل ٹکٹ، ایسے انعامی بانڈز کہ جن میں انسان کی رقم ضائع ہو جاتی ہے، سب جوئے ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ اسی طرح حکومت کی طرف سے جاری کردہ پرائز بانڈز بھی سود اور جوئے کا مرکب ہیں۔ اسی قسم کا حکم بیمے کا بھی ہے، یہ بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔

حواشی

١) رواہ ابوداوٗد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق۔ اسے **امام البانی** نے ''حسن'' کہا ہے۔

٢) صحیح ابن خزیمہ، کتاب الصلاۃ۔

٣) رواہ مسلم، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتھا وفضل الاول فالاول منھا۔

٤) رواہ مسلم، کتاب الصلاۃ، باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیہ فتنۃ۔

٥) رواہ البخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب وقت الفجر۔

٦) سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔

٧) رواہ مسلم، کتاب الصلاۃ، باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیہ فتنۃ وانھا لا تخرج مطیبۃ۔

٨) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب طواف النساء مع الرجال۔

٩) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف فی شوال سنۃ ثمان۔

١٠) سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب التغلیظ فی الانتفاء من الولد۔

١١) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا۔

١٢) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبیﷺ من غشنا فلیس منا۔

١٣) سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب من باع عیبا فلیبینہ۔

١٤) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب اذا بین البیعان ولم یکتما ونصحا۔

١٥) سنن ابی داوٗد، کتاب البیوع، باب فی النھی عن النجش۔

١٦) عون المعبود شرح ابی داوٗد، کتاب البیوع، باب فی النھی عن النجش۔

١٧) صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿**وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا**﴾.

١٨) سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب التغلیظ فی الحیف والرشوۃ۔

١٩) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اثم من ظلم شیئا من الارض۔

٢٠) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اثم من ظلم شیئا من الارض۔

٢١) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب تحریم الذبح لغیر اللہ تعالیٰ ولعن فاعلہ۔

#

1

فکرو نظر

علامہ جاوید احمد غامدی فکر کا تجزیاتی مطالعہ

محمد موسیٰ بھٹو

محترم جناب گرامی قدر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
مدیر اعلیٰ میثاق وحکمت قرآن
السلام علیکم ——— مزاج شریف
آپ جانتے ہیں کہ جاوید احمد غامدی صاحب جدید ابلاغی ذرائع سے جس طرح روشن خیال اسلام کی فروغ پذیری کے لیے کام کر رہے ہیں وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ جاوید صاحب کے فکر کے تجزیاتی مطالعہ پر راقم نے تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ امید ہے کہ دوسرے مضامین روک کر بھی اگست کے میثاق یا حکمت قرآن میں مضمون شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔
خدا کرے مزاج بخیر ہوں۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

علامہ جاوید احمد غامدی صاحب ہمارے ملک کی اُن ممتاز شخصیتوں میں شامل ہیں جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور حد سے زیادہ خود اعتمادی اور اپنی علمی شان کی بنا پر دین وشریعت کے ہر مسئلہ پر جدید ابلاغی ذرائع کے ذریعہ اپنی رائے کے بے باکانہ اظہار میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔

موصوف فلسفہ میں ایم اے ہیں۔ آغازِ کار میں مولانا مودودی جیسے مفکر کے معاونِ

خصوصی رہ چکے ہیں۔ صاحبِ تدبر قرآن کے شاگردِ رشید ہیں۔ استقامت کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ وعزم رکھتے ہیں۔ طویل عرصہ سے پاکستان کے سرکاری افسران کے مرکزی تربیتی ادارہ میں اسلامی موضوعات پر لیکچر دیتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے ملک بھر کے افسران میں ان کے علم وفضل کی شہرت کا تأثر قائم ہے۔ اب ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں سے روزانہ گھنٹوں فہم دین کا پروگرام پیش کرنے کی وجہ سے خواص وعوام میں متعارف ہیں۔ ایک تنظیم کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ طویل عرصہ سے ایسے طلبہ کی ٹیمیں پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو اپنی خصوصی اجتہادی صلاحیتوں کی بنا پر ملک میں علامہ موصوف کے فکر کو متعارف کرانے میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔

جاوید صاحب جدید وقدیم فلسفیانہ مباحث کے فہم کے ساتھ ساتھ قرآنی علوم کے بھی ماہر ہیں، بلکہ اپنے انداز سے یکتائے روزگار ہیں۔

موصوف پچھلے پچیس تیس سال سے کوشاں ہیں کہ ملک میں اپنے فکر کی بنیاد پر ایک طاقتور تنظیم کھڑی کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلسل اپنی بیشتر توانائیاں صرف کر کے نومجتہدینِ اسلام کی ایک ٹیم تیار کی ہے، جو قرآن وسنت، سلف صالحین اور اجماعِ اُمت کے اسلامی فکر کی بجائے اپنے استاد کے فکرِ اسلامی کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔

علامہ جاوید احمد غامدی صاحب کی فکری اٹھان اور ذہنی نشوونما میں جن عوامل نے کام کیا ہے ان میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

(۱) مولانا مودودی کی اقامتِ دین، تبدیلی حکومت اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے جدوجہد پر مشتمل فکر کے خلاف ردّعمل کی نفسیات اور اس کی پختگی۔

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصوف دشمنی، علمائے سلف کے خلاف تند وتیز روش اور احادیث سے بے اعتنائی کے رویہ کے اثرات۔

(۳) مولانا وحید الدین خان کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفر کی عالمی قوتوں اور اُن کی بچھائی ہوئی سازشوں کے جال سے یک طرفہ طور پر اعراض اور محض ایک دائرہ کی حد تک ذاتی اصلاح اور معاشرہ کی اصلاح پر مشتمل فکر کے اثرات۔

(۴) فلسفہ کے مطالعہ اور کتابی دنیا پر قناعت کرنے کی وجہ سے عقلِ محض پر اکتفا کرنا اور عقلِ محض کے سحر میں مبتلا ہو جانا۔

(۵) اپنے والد جو ایک بزرگ کے خلیفہ مجاز تھے، ان کی صحبت سے سحر خیزی کی عادت

# #

کے استحکام کی وجہ سے نفسیاتی نوعیت کے مسائل سے ایک حد تک حفاظت اور خود اعتمادی سے بہرہ وری۔

ذہنی نشو ونما کے اِن محرکات نے علامہ جاوید موصوف کی فکرِ اسلامی کا تانا بانا جن خطوط پر بُنا ہے‘ ان میں سے کچھ چیزیں یہ ہیں:

(۱) اُمت کے بڑے بڑے اماموں‘ امام مالک‘ امام ابوحنیفہ‘ امام شافعی‘ امام احمد بن حنبل اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم اور مجھ میں علم وفضل اور اجتہادی صلاحیتوں کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں‘ جس طرح وہ مطلق مجتہد کے مقام پر فائز تھے‘ اسی طرح میں اور میرے شاگرد بھی مطلق مجتہد کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں یعنی اُن جیسے مقام پر فائز ہونے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی‘ اس لیے کہ قرآن وسنت کا جو علم ان کے پاس تھا وہی علم میرے پاس بھی ہے۔ غور وفکر کے لیے جو ذہانت اُن کے پاس تھی وہی ذہانت ہمیں بھی حاصل ہے۔ چنانچہ مطلق مجتہد کے مقام پر فائز ہوکر وہ اجماعِ اُمت سے ہٹ کر دین کے متفقہ مسائل میں نیا اجتہاد کرکے اس اجتہاد کو قرآن کے نام سے پیش کر کے اپنے نئے مکتبِ فکر کو فروغ دینے کا پورا حق رکھتے ہیں۔

(۲) قرآن کی تشریح کے لیے احادیث کو قانونی حیثیت دینے کی بجائے عقلِ محض کے ذریعہ قرآنی آیتوں کی نئی نئی تأویلیں اور تشریحیں کرتے رہنا اور اس سلسلہ میں سابقہ تحریف شدہ کتب کو استنادی حیثیت سے استعمال کرنا‘ موسیقی اور آلاتِ موسیقی جیسے بنیادی مسائل کے بارے میں پرانی مقدس کتب کے اقتباسات کو سند کی حیثیت سے پیش کرنا‘ جن معاملات میں قرآن اور مقدس کتاب سے سند جواز نہ مل سکے تو اُن معاملات میں نفس کی یرغمال شدہ عقل کے ذریعہ طرح طرح کی تأویلیں کرنا‘ رجم کی سزا (جو احادیث سے ثابت شدہ ہے اور جس پر اجماعِ اُمت ہے) کا انکار کرنا‘ دجال کی شخصیت کا انکار کرنا‘ مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد کی تکذیب کرنا‘ عورت کی امامت کے لیے سند جواز پیش کرنا‘ مرتد کی سزا کی تکذیب کرنا‘ عورت کی عملی زندگی میں بھرپور شرکت‘ اس کی ملازمت‘ صدارت اور وزارتِ عظمیٰ وغیرہ کے عہدہ پر فائز ہونے کا فتویٰ صادر فرمانا‘ مجسمہ سازی‘ فوٹوگرافی‘ تصویرسازی وغیرہ کو آرٹ قرار دے کر موجودہ دَور میں اسے تمدن کی لازمی ضرورت قرار دینا‘ عورت کی طرف سے محرم کے بغیر حج پر جانے کے موقف کی شدت سے وکالت کرنا‘ نکاح کے بارے میں یہ فرمانا کہ اصل چیز لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول ہے اور دونوں کی رضامندی ہے‘

والدین اورعزیزوں کی شرکت وغیرہ سب رسمی چیزیں ہیں‘اس طرح نکاح کے مقدس ادارہ کو بازیچہ ٔاطفال بنانے کی کاوش کرنا‘ گورنمنٹ کی طرف سے لیے گئے ٹیکس کو زکوٰۃ کی ادائیگی میں شمار تصور کرنا اور یہ فرمانا کہ اگر اتنے ہی متقی ہو اور ٹیکس کے بعد زکوٰۃ دینا ہی چاہتے ہوتو دے دو‘وغیرہ وغیرہ۔

(۳) اسلام نام ہے عقل کی اصلاح کا اور عقل کی مدد سے ذاتی اصلاح کا‘ دل کے نام سے ایسی کوئی قوت موجود نہیں ہے جو عقل سے ماورا ہو۔ ذاتی اصلاح ہی اسلام کا ہدف ہے‘ لیکن جہاد وقتال کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ ملک کے سیاسی نظام میں تبدیلی اور صالح ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور کا کام اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیرضروری ہے۔ عالم اسلام اور پاکستان ایک عرصہ سے جس طرح باطل کی عالمی قوتوں کے نرغے میں ہیں اور سارے عالمِ اسلام کی معیشت‘ معاشرت‘ سیاست وغیرہ کی پالیسی سازی کی قوت جس طرح عالمگیریت اور عالمی کفر کے حوالے ہو چکی ہے‘اس عالمی کفر کے خلاف مسلم اُمت میں شعور پیدا کر کے اس سے نجات کی صورت کے پیدا ہونے کے لیے لائحہ عمل وغیرہ جیسی باتیں فضول اور لایعنی ہیں۔ عالمی کفر اور عالمگیریت یہ سب سیاسی اسلام کے علمبرداروں کا واہمہ ہے‘ انہوں نے اس واہمہ کو حقیقت کے طور پر اس لیے پیش کیا ہے تاکہ ذاتی اصلاح اور اصلاحِ معاشرہ کے کام سے اغماض برتا جائے۔

(۴) دنیا بھر میں مسلمان جہاں بھی اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور سامراج کے خلاف جہاد کر رہے ہیں‘ یہ جہاد غیراسلامی اور لایعنی ہے۔ کفر کے خلاف معرکہ آرائی میں قوتیں صرف کرنے کی بجائے مسلمانوں کو اہل کفر کی سرپرستی میں زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے‘ اور جہاد وقتال‘ ملت اسلامیہ کے انفرادی تشخص‘ سامراج اور سامراج کے خلاف جدوجہد جیسے جذباتی نعرے ترک کر دینے چاہئیں۔ مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ کفر کی عالمی ومقامی قوتوں کے بارے میں صبر واعراض کا رویہ اختیار کریں اور اپنی ذاتی اصلاح کی کوششوں میں اس طرح مصروف ہو جائیں کہ انہیں خارجی باطل اور عالمی سطح پر چھائی ہوئی کفر کی قوتیں سرے سے نظر ہی نہ آئیں۔ افغانستان میں مسلمانوں کا جہاد ہو یا کشمیر میں مسلمانوں کی جنگ‘ فلسطین میں مسلمانوں کی جنگ ہو یا عراق میں مسلمانوں کا جہاد‘ یہ ساری لڑائی اپنی اصلاح کے کام سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

جاوید صاحب‘ غلام احمد پرویز صاحب کے اس نظریہ سے متفق ہیں کہ قرآن کی تعبیر کا حق

رسول اللہ ﷺ کو تو حاصل نہیں، البتہ یہ حق انہیں ضرور حاصل ہے۔ ان کی نظر میں حدیث اور سنت کی حیثیت دلیل سے زیادہ نہیں اور وہ سند اور قانون کی حیثیت کی حامل نہیں۔ وہ سنت کی حیثیت کو غیر اہم ثابت کرنے کے لیے مختلف بہانوں کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔ آج سے بارہ سال پہلے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مظفر حسین صاحب نے الطاف حسین قریشی صاحب کے ادارہ کے تعاون سے ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ کے نظریۂ تعلیم کے موضوع پر ایک تقریب منعقد کی تھی، اس تقریب کے صدر موجودہ نائب وائس چانسلر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب تھے، اور مقررِ خصوصی علامہ جاوید احمد صاحب تھے۔ جاوید صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ صحیح احادیث کل بارہ (۱۲) ہیں، اس سے زائد نہیں۔ احادیث کے بارے میں ان کے اس موقف پر ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب نے اُن پر سخت جرح کی تھی اور انہیں فرقۂ غامدیہ کا بانی قرار دیا تھا۔ (ڈاکٹر موصوف اس واقعہ کے راوی ہیں)۔

احادیث کے بارے میں یہ موقف ایسا ہے جس کی جرأت پرویز صاحب کے بعد جاوید صاحب جیسے روشن فکر دانشور نے ہی کی ہے۔ جب احادیث سند اور قانون نہیں ہیں اور قرآن کی تشریح کے سلسلہ میں احادیث کی حیثیت قانونی نہیں ہے اور اللہ کے رسول ﷺ قرآن کی تشریح کے مجاز نہیں ہو سکتے تو اس سے فہم قرآن کے سلسلہ میں جو گمراہی پیدا ہو سکتی ہے اور جو فتنے برپا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

فہم قرآن کے سلسلے میں اللہ کے رسول ﷺ کی قانونی حیثیت کے انکار کے بعد اپنے اجتہاد کے زور سے قرآنی آیات کو جن مزعومہ مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ آسان ہے۔ پرویز صاحب نے ایسا ہی کیا۔ اب علامہ جاوید صاحب یہ کردار فرما رہے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ جاوید صاحب ایک عرصہ سے ٹیلیویژن کے مختلف چینلوں سے نمودار ہوتے رہتے ہیں اور موصوف قرآن کی نئی نئی تأویلات پر مشتمل اپنی فکر اور اپنے اجتہادات سے قوم کو نوازتے رہتے ہیں، ان کے تفردات پر جب بھی جرح کی جاتی ہے تو موصوف فرماتے ہیں کہ یہ میری ذاتی رائے ہے، ضروری نہیں ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں۔ موصوف کی یہ حکمت عملی بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ ہی ہو سکتی ہے کہ اسلامی شریعت کے اہم مسائل پر دین سے ناواقف کروڑہا افراد کے سامنے سنت سے اعراض اور اجماعِ اُمت سے مختلف موقف کو پیش کیا جائے۔ دین کے تسلسل پر ضربِ کاری لگانے اور اسلام کے نام پر روشن خیالی کو مقبول بنانے کی یہ سب سے مؤثر حکمت عملی ہے جو علامہ جاوید صاحب نے اختیار کی ہے۔

جاوید صاحب اپنی دانش سے کام لیتے ہوئے اپنے نئے اسلام ——— صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ نعمت یافتہ لوگوں یعنی سلف صالحین سے مختلف اسلام ——— کے فروغ کی جدوجہد میں مصروف ہی تھے کہ عالمی کفر اپنے حریف کفر کی طاقت سوویت یونین کو شکست دے کر اس کی ٹوٹ پھوٹ میں کامیاب ہوگیا' اور کفر کی اس طاقت کو یہ جنوں سوار ہوا کہ دنیا پر اس کی کلی اور مکمل اجارہ داری بغیر کسی شراکت کے قائم ہو جائے۔ اس مقصد کی راہ میں اسے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص' یعنی اسلامی نظریہ کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کے جداگانہ تشخص کا احساس' جذبۂ جہاد' تحفظِ اسلام و بقائے اسلام اور کفر کی طاقتوں کے مقابلہ میں جان و مال کی آخری حد تک قربانی دینے کا حوصلہ و عزم سخت رکاوٹ نظر آیا۔ چنانچہ عالمگیریت کو اس امر کی ضرورت درپیش ہوئی کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کے خاتمہ کے لیے روشن خیالی پر مشتمل اسلام کو فروغ دینے کی بڑے پیمانہ پر کوشش ہو' اور یہ کام ہر سطح پر ہو۔ اس مقصد کے لیے یعنی علمی حلقوں میں اسلام کے روشن خیالی پر مبنی فکر کو متعارف کرانے کے لیے بعض واقفانِ حال کی تصریح کے مطابق جاوید صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جاوید صاحب کے نئے اسلامی فکر میں عالمی کفر کے مقاصد کے حصول میں پیش قدمی کا سارا انتظام موجود ہے' مثلاً:

(۱) مسلمانوں کے زوال کو مکمل طور پر ان کی اپنی کمزوریوں کا ثمرہ قرار دینا' اس سلسلہ میں مادیت پرست عالمی طاقت کے کردار کی نفی کرنا' جہاد کا اسلامی فریضہ جو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ رہا ہے' اسے غیر اہم اور غیر ضروری ثابت کرنے میں توانائیاں صرف کرنا' دنیا بھر میں مصروف جہادی تحریکوں کی تردید میں صلاحیتیں صرف کرنا' موسیقی اور آلاتِ موسیقی جو ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کی اکثریت کی قوتوں کو جنسی مقاصد میں استعمال کرنے کا موجب بن گئے ہیں' اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کے جواز کا فتویٰ دے کر اس کے خلاف نفرت کے رجحان کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہونا' ذہین افراد کو روشن خیالی پر مشتمل اس نئے فکر کا حامل و ترجمان بنانے کے لیے اپنے تعلیمی ادارہ میں بڑے وظائف دے کر اُن کی خدمات حاصل کرنا' اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بن کر روشن خیالی کی علمبردار حکومت کے ساتھی ہونے کے تصور کو مستحکم کرنا وغیرہ۔

(۲) تزکیہ کے جس ادارہ نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی اکثریت کی اصلاحِ نفس اور تہذیبِ نفس کا کارنامہ سرانجام دیا ہے' اور جس ادارہ نے جنید بغدادی' حسن بصری' سید

عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، مولانا روم، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم جیسی قابل فخر شخصیتیں پیدا کیں، جنہوں نے اربوں انسانوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مسلم نفسیات کے علوم کو مدون بھی کیا، خالص کلامی مباحث اور تصوف کے جزوی مسائل کو بنیاد بنا کر اس پورے ادارہ کی تکذیب وتردید میں توانائیاں صرف کرنا اور اس کے خلاف نفرت وحقارت اور بیزاری کی فضا پیدا کرنا، اس ادارہ کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنے پر اکتفا کرنے کی بجائے اس ادارہ کی مسلّمہ اہمیت کا انکار کرنا اور اس کی افادیت کا کلی انکار کرنا اور اسے صحیح تصورِ اسلامی کو بگاڑنے کا ذمہ دار ٹھہرانا۔

(۳) موصوف کو مکتبہ فراہی کی تربیت کے زیر اثر اور خود اُن کی اپنی فلسفیانہ ذہنیت کی وجہ سے جو سب سے بڑا مغالطہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ائمہ فقہاء نے اپنے دَور کے حالات کی بنا پر جو فقہ تشکیل دی تھی، اسے اُمت بارہ تیرہ سو سال سے اختیار کر کے قرآن سے بہت دور چلی گئی ہے اور قرآن جو ہر دَور کے حالات میں استنباطِ مسائل اور اخذ مسائل کی واحد مستند کتاب ہے، اس پر غور وفکر کے ذریعہ اس سے رہنمائی کا کام اس پورے عرصہ میں معطل ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے تقریباً سارے طبقات ذہنی اعتبار سے عہد جدید میں رہنے کی بجائے بارہ سو سال پہلے کے حالات میں رہ رہے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ فقہی اور ذہنی جمود، علمی پسماندگی اور قرآن سے دُوری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی نفسیاتی صورت حال سے بغاوت اختیار کر کے اور اُمت کے تعامل سے قطع نظر کر کے قرآن پر از سرِ نو غور وفکر کر کے اس سے براہِ راست مسائل اخذ کیے جائیں، اور عہد جدید کے معاشرتی، عائلی، معاشی اور تہذیبی مسائل میں احادیث اور سلف سے بے نیاز ہو کر شریعت کی از سرِ نو تدوین کا کارنامہ سرانجام دیا جائے۔

موصوف کا اصرار ہے کہ اُمت اب تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل اور مجدّدین اُمت کی تصریحات وتحقیقات کی روشنی میں جس سبیل المؤمنین پر گامزن ہے وہ قرآن کے منافی راہ ہے۔ اور اُمت کا یہ سارا علمی وفقہی ذخیرہ نوے فیصد قرآنی نقطۂ نگاہ سے غلط ہے اور مسترد شدہ ہے۔

موصوف مکتبۂ فراہی کے تحت جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلف صالحین، مجددین اُمت اور انعام یافتہ لوگوں کی راہ سے بُعد اختیار کر کے نومجتہدین کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں اور تشریح اسلام کا ایسا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں جو ملت کی تاریخ کا منفرد کارنامہ ہے، اور جو اِن کی نظر میں قرآن کی صحیح، معتبر اور مستند نوعیت کی تعبیر وتشریح ہے۔

ملت کی پوری تاریخ کی تغلیط کرتے ہوئے جاوید صاحب رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو فراموش کر جاتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا کہ: ''میری اُمت کبھی بھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی' اور اُمت میں ہر دَور میں ایسا گروہ موجود و قائم رہے گا جو حق و صداقت کو تھامنے کا فریضہ سرانجام دیتا رہے گا۔ اس گروہ کو نقصان پہنچانے والے انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔''

مزید آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد پیدا ہوگا' جو دین کی تجدید کا فریضہ سرانجام دیتا رہے گا۔ اُمت کی پوری تاریخ ان احادیث کی صداقت کی دلیل ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ جاوید احمد غامدی صاحب کو جو ایک بڑی غلط فہمی لاحق ہے' جس نے انہیں تفردات کی راہ پر لگا کر ان کی ذات کو اپنے لیے اور خود ملت کے لیے بڑی آزمائش بنایا ہے' وہ یہ ہے کہ ان کی نظر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل' اجماعِ اُمت اور اکابرین ملت وغیرہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اور ان سے استفادہ یا اخذ فیض کیے بغیر قرآن سے براہِ راست اخذ مسائل کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے اور مجتہد بنا جا سکتا ہے۔ ہماری نظر میں یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے' قرآن نے سبیل المؤمنین کی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور مؤمنین کے علاوہ دوسری راہ کے اختیار کرنے پر سخت انتباہ دیے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ﴾ (النساء:۱۱۵)

''اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد جس نے رسول کی مخالفت کی اور مؤمنین کی راہ کے برعکس راہ اختیار کی تو ہم اسے اس راہ پر جانے دیں گے' لیکن پھر اسے جہنم میں داخل کریں گے۔''

اُمت میں چودہ سو سال سے قرآن فہمی کے دعویٰ کی بنیاد پر جو فتنے پیدا ہوئے ہیں وہ خوارج اور معتزلہ کی صورت میں ہوں یا قرامطہ' باطنیہ اور اسماعیلیہ کی صورت میں' ان سارے گروہوں کو ملت نے یکسر طور پر مسترد کیا ہے۔

دین اسلام کی تعلیمات کوئی نئی تعلیمات نہیں ہیں کہ اسلامی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد وہ پہلی بار کسی شخصیت پر القا ہوئی ہوں' بلکہ دین اس تعامل و تسلسل کا نام ہے جس پر شروع سے مؤمنین گامزن رہے ہیں۔

علامہ جاوید صاحب عقلیت کے زیر اثر اس اہم نکتہ کے فہم سے قاصر رہے ہیں کہ دینِ

اسلام کے سلسلہ میں اللہ کی حکمت بالغہ اس امر کی متقاضی ہوئی کہ ختم نبوت کے بعد قرآن و سنت کی بنیاد پر بنیادی اسلامی علوم کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایسی ہستیاں بھی کھڑی کی جائیں جن سے اُمت میں فہمِ دین اور قرآن وسنت کے صحیح اہداف کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اخلاص اور یقین کی تحصیل کے سلسلہ میں رجوع ہو اور اُمت میں انہیں روشنی کے مینار کی حیثیت حاصل ہو۔ اور جو سعید شخصیتیں اپنی ہستیوں کو مٹا کر اس طرح کی عظیم شخصیتوں سے تبحر علمی اور رسوخ فی الدین کے لیے رجوع ہوں تو انہیں اپنی ہستی کی فنا کی قیمت پر روحِ اسلام اور حقیقی فہمِ اسلام کی دولت عطا کی جائے۔

اُمت میں اب تک ائمہ‘ فقہاء اور علمائے ربّانی کو جو مقام حاصل ہوا ہے وہ اللہ کی اس مصلحتِ بالغہ کی واضح دلیل ہے۔ بیج جب اپنی ہستی کو مٹا کر زمین میں فنا ہو جاتا ہے تو گل و گلزار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بیج اگر اپنی فنائیت سے انکار کر دے تو ظاہر ہے وہ بارآور نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

شخصیتوں کے حوالے سے اللہ کی اس حکمتِ بالغہ کا فہم اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ محدثوں‘ فقیہوں اور تزکیہ کے اماموں کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی تدوین اور قرآن وسنت سے مسائل اخذ کرنے کے لیے ان کی فنائیت‘ برسوں تک راتوں کی راتیں غور وفکر اور عبادت و ریاضت میں صرف کرنا اور تھکاوٹ کا احساس تک نہ ہونا‘ زہد‘ توکل‘ قناعت‘ دنیا سے بے رغبتی اور تعلق مع اللہ اور علوم اسلامی میں رسوخ کے لیے شب و روز کے مجاہدے وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی عمومی صلاحیت و استعداد سے ماورٰی ہیں اور محض اور محض قدرت کا عطیہ ہیں۔ یہ خدا کے انعام یافتہ لوگ تھے‘ ایسے انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے ہم روزانہ اپنی نمازوں میں بیسیوں بار دعا طلب کرتے ہیں۔

اس طرح کی انعام یافتہ شخصیتوں کی تکذیب و تردید کی راہ اختیار کر کے جو فہم قرآن حاصل ہوگا وہ یہی ہوگا کہ اُمت کا اجتماعی ضمیر اسے کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا‘ چاہے آپ ابلاغ کے سارے ذرائع استعمال کر کے ملت پر اس فہم کو مسلط کرنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔

مسئلہ کی تفہیم کے لیے یہاں ایک اہم نکتہ بیان ہونا ضروری ہے‘ وہ یہ کہ ایک عامی انسان سے اگر یہ پوچھا جائے کہ دین اسلام کا وہ فہم صحیح ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ‘ اُمت کے کروڑہا علمائے ربانی‘ صلحاء اور اولیائے کرام گامزن رہے ہیں یا قرآن سے ماخوذ علامہ

جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر' جو تفردات سے بھری ہوئی ہے' جس میں جہاد و قتال کی نفی کے ساتھ ساتھ موسیقی اور مجسمہ سازی کے جواز کے فتاویٰ بھی شامل ہیں' تو جو جواب آئے گا وہی جواب برحق ہوگا۔ اسی جواب سے سبیل المؤمنین اور سبیل الغامدی کی صحت و عدم صحت متعین ہو جائے گی۔ ''خلق کی آواز خدا کی آواز ہے'' کے مصداق فیصلہ کے لیے یہی بات کافی ہے۔

محترم جاوید صاحب سے میرا دوستی کا تعلق قائم رہا ہے اور ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا ہے' ان ملاقاتوں میں مجھے موصوف کی یہ خصوصیت نظر آئی کہ جب بھی ان کی زبان سے ائمہ فقہ اور مجددین اُمت کا نام ادا ہوا تو وہ اس طرح ادا ہوا گویا وہ اِن کے تلامذہ سے بھی کم حیثیت کے حامل ہیں' اور علم و فضل میں وہ اِن کے مقابلہ میں طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجددین اُمت اور علمائے ربانی کے استہزاء کا ہی نتیجہ ہے کہ ان سے سبیل المؤمنین اور **اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ** کی دولت عظمیٰ چھن گئی ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ اس محرومی کو محرومی سمجھنے کی بجائے اس پر خوشی و مسرت محسوس کی جا رہی ہے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ملک کے ذہین طبقات کو بھی **اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ** کی راہ سے ہٹا کر بدترین فرقہ پرستی (نئے فرقہ) کی راہ پر گامزن کیا جا رہا ہے۔

کاش جاوید صاحب اور ان کے ساتھی فقہائے اُمت' کبار علمائے ربانی اور ہمارے درمیان تبحرِ علمی اور سیرت و کردار کا جو زمین و آسمان کا فرق ہے اس پر ازسرِ نو غور فرمائیں۔

امام شافعیؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ایک بار طویل سفر طے کر کے اپنے شاگرد امام احمد بن حنبل کے ہاں مہمان ہوئے' سخت تھکاوٹ کی حالت میں پہنچے' عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔ صبح کی نماز کے بعد حال احوال ہوا تو معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز میں امام احمد بن حنبلؒ نے قرآن کی جو آیات پڑھی تھیں۔ ساری رات اُن آیات پر غور و فکر میں بسر ہوئی اور اُن آیات سے انہوں نے ایک سو تین فقہی مسائل استنباط فرمائے۔

یہ ایک ہی رات کا قصہ نہیں' بلکہ سارے ائمہ فقہ اور کبار اولیائے کرام کی ساری راتیں فہم دین اور اللہ کی عبادت میں بسر ہوتی تھیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کی عزیمتِ کردار اور اللہ کی خاطر نفس کی فنائیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ معتصم نے جب انہیں خلق قرآن کے مسئلہ پر کوڑے لگوائے اور اُن کا جسمانی نظامِ زندگی بری طرح مضمحل ہو گیا تو فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں ہے کہ جو لوگوں

کے قصور معاف کرتے ہیں اللہ قیامت کے دن ان کے قصور معاف فرمائے گا' اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے تھے: تم گواہ رہنا' میں نے معتصم کو معاف کر دیا۔ کیا اس سے بڑھ کر صبر' تحمل اور کردار کی عزیمت ہوسکتی ہے؟ سارے علمائے ربانی اسی طرح کی سیرت وکردار سے ہی بہرہ ور رہے ہے۔

اِدھر اس سلسلہ میں ہماری جو حالت ہے وہ از حد قابل رحم ہے۔ مثال دینا اگرچہ مناسب نہیں' لیکن تفہیم کی خاطر مثال کے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔ علامہ جاوید صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب (جن کی تربیت سے انہیں سلف صالحین سے بُعد کی راہ نصیب ہوئی) کے بارے میں روایت ہے کہ موصوف کی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے سخت ناراضگی ہوئی' اس پر مولانا کی صحت متأثر ہونے لگی اور تدریس کا عمل متأثر ہونے لگا۔ ان کے شاگرد رشید خالد مسعود صاحب نے جب انہیں اطمینان دلایا کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر ''اسرار نامہ'' لکھ کر ان کے کردار کو بے نقاب کریں گے' تب موصوف کی طبیعت بحال ہوئی۔ اسی طرح موصوف کے مولانا مودودی سے اختلافات ہوئے تو ان اختلافات کے اظہار کے لیے تحریر میں جو انداز اختیار فرمایا وہ کم از کم کسی عالم کی شان کے منافی ہی نظر آتا ہے۔

ائمۂ فقہ اور کبار علمائے ربّانی کو اُمت نے جو حیثیت دی ہے اس حیثیت کا انکار کرنے کا جو نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے' وہ یہی ہے کہ نورِ نبوت کے جو اجزاء رسول اللہ ﷺ سے صحبت کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاصل فرمائے' اور صحابہ اور تابعین کی صحبت سے علمائے ربانی نے حاصل کیے اور اخذ نور کا یہ سلسلہ اُمت میں تسلسل سے آ رہا ہے' اس نور سے محرومی رہے گی۔ دوم یہ کہ اُمت کے مستقل دھارے سے رشتہ کٹ کر جماعتی اور گروہی دلدل کی ابتلاء و آزمائش کی سزا نصیب ہوگی اور اپنے نئے فکر کے حامل افراد پر مشتمل گروہ خود نئی فرقہ پرستی کی صورت میں سامنے آئے گا۔

عقل جس پر علامہ جاوید صاحب فدا ہو رہے ہیں اور عقل کی وجہ سے وہ صحابہؓ کے تعامل اور علمائے ربانی کے اجماع کے انکار کی راہ پر گامزن ہیں' وہ عقل (سلامتیٔ دل کے اثرات کے بغیر) کیا ہے؟ وہ تو عادتوں ہی کی محتاج اور غلام ہے۔ ماحول اور تربیت کے اثرات سے جس قسم کی عادتیں مستحکم ہوں گی اور جس قسم کی سوچ کی راہیں متعین ہوں گی عقل اپنی عادتوں اور سوچ کی انہی راہوں ہی کا تو نام ہے۔ اگر میں نے اجماعِ اُمت کے مخالف ماحول میں تربیت حاصل کر کے اُن کے خلاف خاص قسم کا ذہن پہلے سے بنا لیا ہے تو اب عقل بیچاری تو ایک خاص

قسم کے فکر کی یرغمال ہوگئی' اس طرح کی عقل فہم قرآن کی صلاحیت سے کس طرح بہرہ ور ہوگی جب تک اسے تعلیم و تربیت اور بے جا صحبت کے اثرات سے پاک نہ کیا جائے؟ اور تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات ایسے ہوتے ہیں جن کا ازالہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تعلیم و تربیت کے خاص ماحول سے جب عقل میں فکر کی خاص راہیں متعین ہوگئیں تو اب عقل کے لیے یہ از حد دشوار ہے کہ وہ خاص شاہراہوں سے ہٹ کر قرآن سے اس کا صحیح مطلب و مفہوم اخذ کر سکے۔ اس طرح عقل حقیقی فہم قرآن کے سلسلہ میں خود پردہ بن جاتی ہے۔ جب تک دعویٰ سے دستبردار ہو کر دل کے زیر اثر عقل کی تہذیب نہ ہو یہ صورت حال قائم رہتی ہے۔ جدید علم نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ انسان یہ کہتا ہے کہ میری عقل یہ کہتی ہے۔ یہ دراصل عقل نہیں ہوتی' بلکہ نفس کی تأویلی صورتیں ہوتی ہیں جو عقل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں فلسفۂ نفسیات پر لکھی گئی مولانا عبدالماجد دریابادی کی ایک کتاب جو انہوں نے الحادی فکر سے متأثر ہونے کے دَور میں لکھی تھی' اس کا ایک اقتباس دینا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''عقل' عقل جس پر آج اتنا ناز کیا جارہا ہے' خود وہ کیا ہے' عادت ہی کی ایک صورت ہے' جو عادت چاہیے ڈال لیجیے' بس وہی رفتہ رفتہ عقل و فہم بن جائے گی۔ جب ہی تو ہمارے حکیم شاعر حالی فرما گئے ہیں: ؎
>
> دیکھ عادت کا تسلط' میں نے عادت سے کہا
> گھیر لی عقل صواب اندیش سب کی تو نے
> ہنس کے عادت نے کہا عقل ہے مجھ سے الگ
> میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے''

جاوید صاحب سے مجھے محبت رہی ہے' لیکن ان کے بعض مضامین کے مطالعہ اور ٹی وی پر اُن کی تقاریر سے ان کے فکر کے جو پہلو اُجاگر ہوئے' اس سے ان سے ہمدردی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہ مضمون دراصل اسی جذبۂ ہمدردی میں ہی لکھا گیا ہے۔ جب اپنے ہی جسم کے کسی حصہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر کے نشتر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور ڈاکٹر کا یہ نشتر بظاہر دشمنی نظر آتی ہے' لیکن بباطن وہ دوستی و خیر خواہی ہی ہوتی ہے۔ جاوید صاحب کے نام میرے لکھے ہوئے خطوط اور جاوید صاحب کی طرف سے جوابی خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ طرفین میں جذباتِ محبت موجود رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں جاوید صاحب کا ایک خط نقل کرنا شاید افادیت کا حامل نظر آئے۔ لکھتے ہیں:

۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء

محترمی ومکرمی محمد موسیٰ بھٹو صاحب

آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ آپ کی تنقید سے آپ کے ساتھ میری محبت میں کمی آ جائے گی؟ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، حمایت حق کے جذبہ سے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تصوف پر میری تنقید کو بھی آپ اسی جذبے پر محمول کرتے ہیں۔ خیر خواہانہ تنقید سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے! میرے دل میں آپ کے خلوص، للّٰہیت اور حق کے ساتھ آپ کی محبت کی بڑی قدر ہے۔ باور کیجیے اس تنقید کو پڑھنے کے بعد اِس میں اضافہ ہی ہوا ہے، ہرگز کوئی کمی نہیں آئی۔ میرے لیے تو یہی بہت خوشی کی بات ہے کہ برسوں کے بعد آپ نے خط لکھا۔ کیا بعید ہے کہ اب ملاقات کی سعادت بھی کسی وقت حاصل ہو جائے۔ والسلام جاوید

جہاں تک جاوید صاحب کے اس موقف کا تعلق ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص کو بنیاد بنا کر ہر دَور کے مسائل میں اجتہاد کے ذریعے نئی راہوں کا تعین کرنا یہ نہ صرف ضروری ہے، بلکہ اسلام جیسی دائمی شریعت کی علمبردار شریعت کا اقتضاء یہی ہے کہ ایسا ہو، اگرچہ اجتماعی طور پر اجتہاد کا راستہ بند ہوا ہے، لیکن علمائے ربانی کی طرف سے ہر دَور میں قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر اور ائمہ وفقہاء کی تصریحات سے استفادہ کرتے ہوئے اجتہاد ہوتا رہا ہے۔ اب بھی بعض باصلاحیت علمائے کرام نئے مسائل میں اجتہاد کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ جمود زیادہ ہے۔ فقہاء کی رائے سے ہٹ کر نصوص پر غور وفکر کے ذریعے نئی راہوں کی تلاش کا عمل سست ہے، لیکن اجتہاد کی راہ میں ایک دوسری اہم رکاوٹ بھی ہے، وہ یہ ہے کہ اجتہاد کے لیے جس تبحر علمی، رسوخ فی العلم، بصیرت وبصارت، قلبی روشنی، قرآن وسنت پر عبور اور فقہائے اُمت کے سارے ذخیرہ پر گہری نظر اور اعلیٰ درجہ کا تقویٰ اور اُمت کے مزاج سے واقفیت مطلوب ہے، زوال پذیر دور میں اس کا سخت فقدان ہے۔ اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اجتہاد کے نام پر پچھلے سوڈیڑھ سو سال سے جو تشریحاتِ اسلام، تعبیراتِ دین اور مسائل کی جو تفہیم سامنے آ رہی ہے، اس میں جدیدیت کے پیدا کردہ تعلیمی وتربیتی اثرات بری طرح کارفرما ہیں اور اس سے سب سے بڑا خطرہ جو پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اجتہاد کے نام پر قرآن وسنت کی صحیح تعبیر کا جو تسلسل اُمت میں چودہ سو سال سے قائم ہے، وہ منقطع ہو رہا ہے۔

زوال کے دَور میں تو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ بنیادی سرمایہ کا

اس طرح تحفظ کیا جائے کہ یہ سرمایہ کسی قیمت ضائع نہ ہونے پائے، اگر حالات ایسے ہیں کہ اس سرمایہ کے کاروبار میں استعمال سے اس کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ ہے تو یہ خطرہ مول لے کر بنیادی سرمایہ کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔

اِس وقت دانشورانِ ملت کے ذہنوں پر جدیدیت کا سودا سمایا ہوا ہے۔ عورت کی آزادی اور عملی زندگی میں اس کی بھرپور شرکت سے لے کر سودی کاروبار کی بعض عام شکلوں تک کو وہ اجتہاد کے ذریعہ سندِ جواز فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

ترقی پسندی پر مشتمل نئے اسلام کی تیاری و تشکیل کا کام اِس وقت عالمگیریت کی سرپرستی میں تیز رفتاری سے ہو رہا ہے، اور اس نئے اسلام کو ابلاغی ذرائع سے متعارف کرانے کا بھی بڑے پیمانہ پر انتظام ہو رہا ہے۔ ان حالات میں کیا حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ سلف و خلف کی ساری علمی تحقیقات سے بے نیاز ہو کر اجتہاد کے ذریعے بنیادی سرمایہ کو محفوظ کرنے میں توانائی صرف کرنے کی بجائے بنیادی سرمائے کو ہی سرے سے خطرات میں ڈالا جائے؟

امید ہے کہ جاوید صاحب ان نکات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (34)

ترکی (۲)

(TURKEY)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

قبولِ اسلام کے بعد ترکوں کی تاریخ بھی اتنی ہی طویل، پیچ دار اور گنجلک ہے جتنی ہندی مسلمانوں کی۔ جس طرح ہندوستان کے مسلمان محمد بن قاسم، پھر ایک صدی کے بعد محمود غزنوی، پھر شہاب الدین غوری، پھر سلطنت دہلی، خاندانِ غلاماں، خاندانِ بلبن، خاندان خلجی، خاندان تغلق، خاندان لودھی، خاندان مغلیہ سے ہوتے ہوئے مغربی استعمار کی غلامی میں آئے، اسی طرح ترکوں بالخصوص سلطنت عثمانیہ کی تاریخ بھی ایسے ہی کئی مراحل سے گزری ہے۔ مؤرخین نے سلطنت عثمانیہ کو پانچ ادوار میں منقسم کیا ہے۔ پچھلی قسط میں ہم سلطان محمد فاتح کی وفات تک پہنچ چکے تھے، جن کا تعلق دوسرے دَور سے تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں ادوار کا ایک نقشہ بجائے مضمون کے آخر میں دینے کے، یہاں آغاز ہی میں دیا جائے۔

پہلا دور: سلطنت عثمانیہ کا قیام اور اس کی توسیع۔ امیر تیمور کے حملے سے پیدا ہونے والے عارضی انحلال تک۔

- عثمان اوّل — 1299ء تا 1326ء (ہندوستان کے سلطان علاء الدین خلجی کا ہم عصر)
- اورخان (بن عثمان اوّل) — 1326ء تا 1359ء
- مُراد اوّل (بن اورخان) — 1359ء تا 1389ء
- بایزید اوّل یلدرم (بن مراد اوّل) — 1389ء تا 1402ء

بایزید کا عہد 20 ؍جولائی 1402ء کو ختم ہوا' جب وہ انقرہ کی لڑائی میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کے بعد گیارہ سال کا عرصہ ایسا گزرا جس میں بایزید کے لڑکے عیسیٰ' محمد' سلیمان اور موسیٰ تاج و تخت کے لیے آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ اس خانہ جنگی کا خاتمہ یوں ہوا کہ صوفیہ کے قریب چامورلی کے مقام پر جولائی 1413ء میں محمد نے موسیٰ پر فتح پائی۔

دوسرا دور: اس دَور میں سلطنت بحال ہوئی' بڑی تیزی سے پھیلی اور اپنی انتہائی وسعت کو پہنچ گئی۔

- محمد اوّل (بایزید اوّل کا بیٹا) 1413ء ۔ 1421ء
- مراد ثانی (بن محمد اوّل) 1421ء ۔ 1451ء
- محمد ثانی فاتح (بن مراد ثانی) 1451ء ۔ 1481ء

(یہاں تک کے حالات ''میثاق'' جولائی 06ء میں مذکور ہوئے)

- بایزید ثانی (بن محمد ثانی) 1481ء ۔ 1512ء
- سلیم اوّل (بن بایزید ثانی) 1512ء ۔ 1520ء
- سلیمان اوّل قانونی (بن سلیم اوّل) 1520ء ۔ 1566ء

(ہندوستان میں مغل بادشاہ بابر' ہمایوں' اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر)

تیسرا دور: اس دَور میں سلطنت اپنے تمام مقبوضات پر بدستور قابض رہی' تا آنکہ ہنگری کا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔

- سلیم ثانی (بن سلیمان اوّل) 1566ء ۔ 1574ء
- مراد ثالث (بن سلیم ثانی) 1574ء ۔ 1595ء
- محمد ثالث (بن مراد ثالث) 1595ء ۔ 1603ء
- احمد اول (بن محمد ثالث) 1603ء ۔ 1617ء
- مصطفیٰ اوّل (بن محمد ثالث) 1617ء ۔ 1618ء
- عثمان ثانی (بن احمد اوّل) 1618ء ۔ 1622ء
- مصطفیٰ اوّل' باردوم 1622ء ۔ 1623ء
- مُراد رابع (بن احمد اوّل) 1623ء ۔ 1640ء
- ابراہیم (بن احمد اوّل) 1640ء ۔ 1648ء
- محمد رابع (بن ابراہیم) 1648ء ۔ 1687ء
- سلیمان ثانی (بن ابراہیم) 1687ء ۔ 1691ء

(اورنگ زیب عالمگیر کا ہم عصر)

- احمد ثانی (بن ابراہیم) 1691ء۔ 1695ء
- مصطفیٰ ثانی (بن محمد رابع) 1695ء۔ 1703ء

چوتھا دور : اس دَور میں سلطنت عثمانیہ بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اور طاقتور باج گزار امراء نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

- احمد ثالث (بن محمد رابع) 1703ء۔ 1730ء
- محمود اوّل (بن مصطفیٰ ثانی) 1730ء۔ 1754ء
- عثمان ثالث (بن مصطفیٰ ثانی) 1754ء۔ 1757ء
- مصطفیٰ ثالث (بن احمد ثالث) 1757ء ۔ 1774ء
- عبدالحمید اوّل (بن احمد ثالث) 1774ء۔ 1789ء
- سلیم ثالث (بن مصطفیٰ ثالث) 1789ء۔ 1807ء (ٹیپو سلطان کا ہم عصر)
- مصطفیٰ رابع (بن عبدالحمید اوّل) 1807ء ۔ 1808ء
- محمود ثانی (بن عبدالحمید اوّل) 1808ء۔ 1839ء

پانچواں دور : مغربی تہذیب وتمدن‘ نظامِ حکومت اور خیالات وافکار کے زیر اثر زوال کی رفتار رُک گئی۔

- عبدالمجید (بن محمود ثانی) 1839ء۔ 1861ء
- عبدالعزیز (بن محمود ثانی) 1861ء۔ 1876ء
- مُراد خامس (بن عبدالمجید) 1876ء۔
- عبدالحمید ثانی (بن عبدالمجید) 1876ء۔ 1909ء
- محمد خامس (بن عبدالمجید) 1909ء۔ 1918ء
- محمد سادس (بن عبدالمجید) 1918ء۔ 1922ء

29/اکتوبر 1923ء سے مصطفیٰ کمال پاشا کی صدارت میں جمہوری حکومت کا آغاز ہوا۔

❁ ❁ ❁

گزشتہ قسط (مطبوعہ ’’میثاق‘‘ بابت شمارہ جولائی 2006ء) کے اختتام پر سلطان محمد ثانی فاتح کی وفات کے بعد اس کا لڑکا بایزید ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس نے تیس سال اطمینان وامن سے حکومت کی۔ محمد اوّل سے لے کر بایزید ثانی کے عہد تک (1413ء تا 1512ء) عثمانیوں کی بیشتر توجہ یورپ میں عثمانی طاقت کے قیام ودوام پر مبذول رہی۔ خود سلاطین بھی زیادہ وقت یورپ ہی میں گزارتے تھے‘ جہاں انہوں نے بہت سی فوجی مہمات کی قیادت بذاتِ خود کی۔ محمد اوّل کے زمانے میں جب

ترکوں نے البانیہ اور موریا میں پیش قدمی کی تو وینس سے ان کا تصادم ہو گیا۔ اسی طرح جب مراد ثانی کے عہد میں ترکوں نے سربیا اور وولیکیا میں فتوحات حاصل کیں تو ہنگری کی سلطنت اُن کے مقابلے میں آ کُودی۔ یہ دوسری اہم عیسائی سلطنت تھی جو اُن کے مقابل صف آراء ہوئی۔ یہ لڑائیاں اور فتوحات خود سلاطین کے حکم سے نہیں ہوئی تھیں، بلکہ ان کا اہتمام سرحدوں کے امراء خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے ابتدائی نتائج تو اکثر اوقات یہی نکلتے کہ چند شہروں پر قبضہ ہو جاتا، جہاں ایک قلعہ گیر فوج کے حاکم کی حیثیت سے متعین کر دیا جاتا تھا، مگر مفتوحہ علاقے کا بیشتر حصہ مقامی حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہنے دیا جاتا تھا، جو خراج پیشکش کی صورت میں ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ قسطنطنیہ اور باقی بوزنطینی مقبوضات نے بھی اس طریق سے مدت دراز تک اپنی نیم خود مختارانہ حیثیت کو قائم رکھا، بلکہ کئی بار انہوں نے محاصرین کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا، مگر آہستہ آہستہ عیسائیوں کی سیاسی اور ثقافتی و تہذیبی آزادی کے یہ گڑھ مسخر ہوتے گئے۔ 1453ء میں قسطنطنیہ بھی فتح ہو گیا، جس کا ترکوں اور اہل مغرب دونوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا، مگر اس سے سلطان محمد فاتح کے سیاسی منصوبے کے ایک جزو ہی کی تکمیل ہوئی (اس منصوبے سے مقصد یہ تھا کہ بلقان کا سارا جزیرہ نما براہِ راست سلطنت عثمانیہ کے زیرِ نگیں آ جائے) البتہ سلطان محمد فاتح کی وفات تک یہ منصوبہ تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ البانیہ اور موریا میں ابھی تک اہل وینس کی چند املاک موجود تھیں اور شمال میں بلغراد کا شہر ابھی تک ہنگری والوں کے قبضے میں تھا، لیکن اس کے ساتھ بوسنیا تک پر ترکوں کی حکمرانی تھی۔ رہوڈس کے سوا بحرایجہ کے مجمع الجزائر کو بھی اسی طریق سے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

اس تمام مدت میں یورپ کی عیسائی سلطنتیں اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہیں کہ صلیبی جنگوں کی منصوبہ بندی کر کے ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ عثمانیوں کے ایشیائی مخالفین سے رسم وراہ پیدا کرتی رہیں، لیکن اس سلسلے میں حقیقی معنوں میں کبھی کوئی بڑی مہم تیار نہ ہو سکی۔

بایزید ثانی کا دَور امن وامان میں گزر گیا۔ اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کی حدود میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا، لیکن اُس کے جانشینوں نے سلطنت عثمانیہ کو چند سال میں دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت بنا دیا۔ بایزید ثانی کے بعد اُس کا لڑکا سلیم اوّل (1512ء۔1520ء) تخت نشین ہوا۔ سلیم اوّل کا عہد سلطنت عثمانیہ کا ایک زریں دَور ہے۔ عثمانیوں کا رُخ اب تک یورپ کی طرف تھا۔ مشرق کی مسلم حکومتوں سے ان کی بہت کم لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن سلیم اوّل نے یورپ کی بجائے مشرق کا رُخ کیا۔

چالدران کی جنگ

اُس زمانے میں ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت تھی اور مصر و شام پر مملوک خاندان حکمران تھا۔ مصر اور ایران کی ان حکومتوں نے عثمانی ترکوں کے خلاف معاہدہ کر لیا تھا اور بعض باغی

عثمانی شہزادوں کو پناہ بھی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں اور عثمانی ترکوں میں کبھی کبھی سرحدی لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ اس صورت حال میں سلیم اوّل نے دونوں حکومتوں کو ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جب تک سلطنت عثمانیہ کے پڑوس میں ایران و مصر کی طاقتور حکومتیں مخالف رہیں گی، مسلمان یورپ کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکیں گے۔

سلیم اوّل نے 1514ء میں اسماعیل صفوی کو چالدران کے میدان میں شکست دے کر اس کے دارالحکومت تبریز پر قبضہ کرلیا۔ سلیم چاہتا تھا کہ پورا ایران فتح کر کے صفوی حکومت کو بالکل ختم کر دے، لیکن اُس کی فوجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور سلیم کو واپس ہونا پڑا۔ ایران کی مہم سے واپسی کے بعد سلیم نے مصر کا رُخ کیا۔

فتح مصر

1514ء میں حلب کے پاس مرج دابق کی جنگ میں مملوکوں کو شکست دے کر سلیم اوّل نے شام و فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ مصر کی طرف بڑھا۔ قاہرہ کے پاس ردانیہ کے مقام پر 1517ء میں دوسری بڑی جنگ ہوئی اور سلیم مملوکوں کو شکست دے کر قاہرہ میں داخل ہو گیا۔ حجاز پر چونکہ مصر کی بالادستی تھی، اس لیے مصر پر عثمانی قبضہ ہو جانے کے بعد حجاز کے امیر نے مکہ اور مدینہ کی کنجیاں سلیم کو بھیج کر عثمانیوں کی اطاعت کر لی۔ مصر سے واپسی پر سلیم عباسی خلیفہ متوکل سوم کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ خلیفہ متوکل نے آنحضرت ﷺ کے تبرکات یعنی علم، تلوار اور چادر مبارک، جو خلفائے عباسیہ کے پاس بطور نشانِ خلافت چلے آتے تھے، سلیم کے حوالے کر دیے۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل استنبول میں ایک تقریب کے دوران خلافت سے سلیم کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا۔ اس طرح خلافت عثمانی ترکوں کو منتقل ہوگئی۔

مصر سے واپسی کے بعد سلیم ایک نئی مہم کی تیاری کر رہا تھا کہ اُس کا انتقال ہو گیا۔

سلیم اوّل نے صرف آٹھ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے سلطنت عثمانیہ کا رقبہ دوگنا کر دیا۔ اب عثمانی ترک بلاشبہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن چکے تھے۔ سلیم ایک بڑا فاتح اور اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا۔ اس کی انتظامی صلاحیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سلطان محمد فاتح اور سلیمان قانونی کے ساتھ اس کا شمار تین بڑے عثمانی سلاطین میں کیا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کا شاعر تھا اور ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، لیکن وہ مزاج کی درشتی اور خون ریزی کے معاملے میں محمد فاتح سے بھی بازی لے گیا تھا۔ اسی وجہ سے ترکی میں اس کو یاوُز (yavoz) یعنی مہیب اور درشت مزاج کہا جاتا ہے۔ قاہرہ اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے قتلِ عام اس کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔ اُس نے اپنے کئی وزیروں کو ذرا ذرا سی بات پر قتل کرا دیا۔ مشرقی ترکی میں کئی ہزار افراد اس کے حکم سے بغاوت کے الزام میں قتل کر دیے گئے۔

اُس زمانے میں اُندلس (ہسپانیہ) کے مسلمانوں پر عیسائی بہت ظلم ڈھا رہے تھے۔ سلیم نے اس کے ردّعمل میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی آبادی کا قتل عام کرنا چاہا' لیکن جس طرح سکندر لودھی کے سامنے ملاّ عبداللہ تلنبی نے آڑے آ کر ہندوؤں کو قتل عام سے بچایا تھا' اسی طرح یہاں بھی شیخ الاسلام علی جمالی نے یہ کہہ کر کہ ذمی آبادی کو شرعاً قتل نہیں کیا جا سکتا' سلطان سلیم کو فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی وجہ سے نہ صرف لاکھوں بےقصور عیسائیوں کی جانیں بچ گئیں' بلکہ خود سلیم بھی ایک بڑے ظلم سے بچ گیا۔ یہ واقعہ شیخ الاسلام علی جمالی کی غیر معمولی جرأت اور اُن کے کردار کی بلندی کا ثبوت بھی ہے۔ سلیم کو جو ذرا سی مخالفت پر وزیروں تک کو قتل کرا دیتا تھا' اپنے فیصلے سے روکنا معمولی بات نہیں تھی۔ شیخ الاسلام نے یہ کام جان کو خطرے میں ڈال کر کیا۔ یہ واقعہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ سلیم کی نظر میں علماء کا کس قدر احترام تھا۔

سلیم اوّل کے بعد اس کا لڑکا سلیمان (1520ء تا 1566ء) 26 سال کی عمر میں بادشاہ ہوا۔

(جاری ہے)